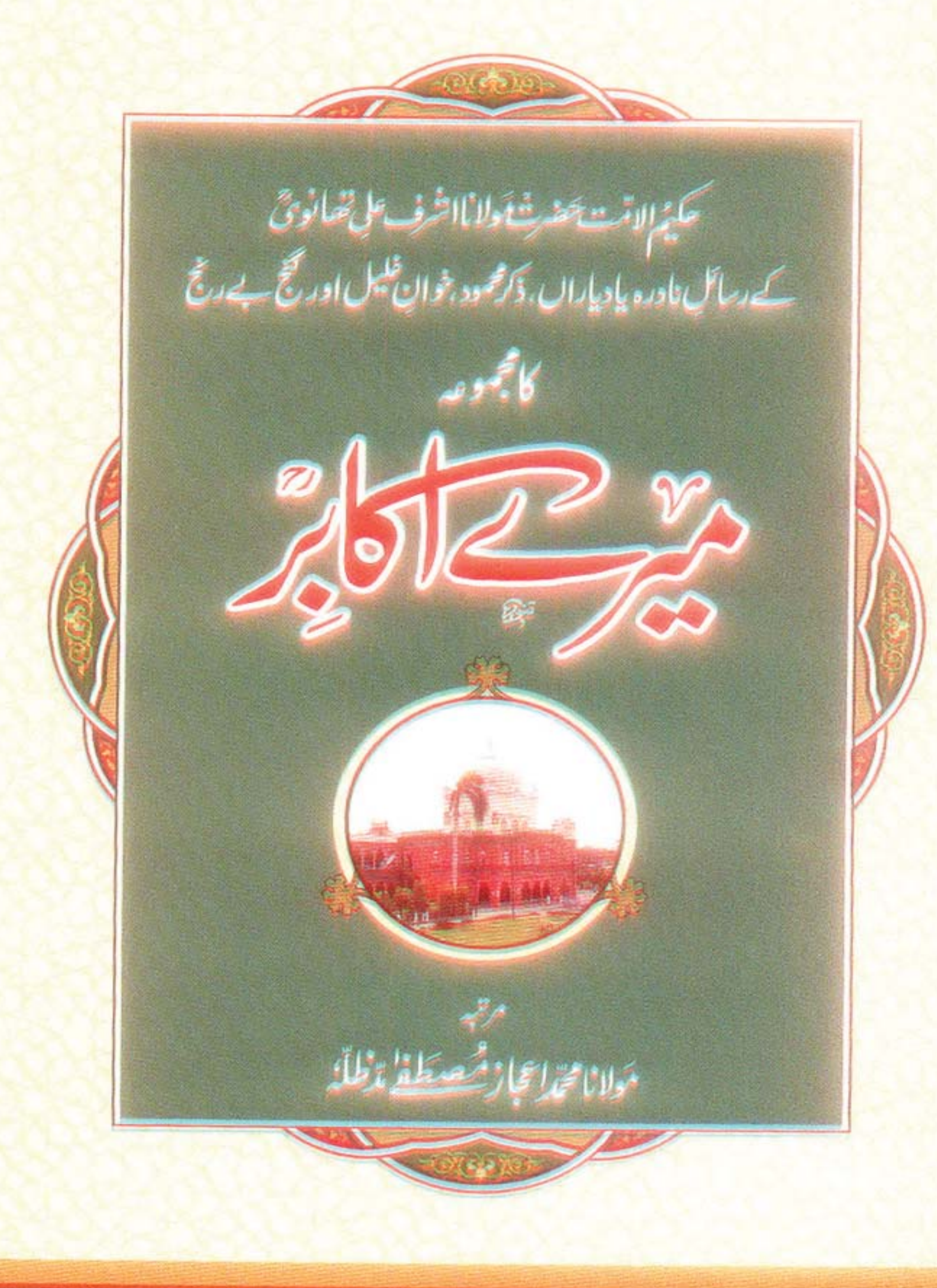


مکتبہ رشیدیہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے
اکابر دیوبند پر نایاب رسائل کا مجموعہ

میرے اکابر

جامع و مرتب
مولانا محمد اعجاز مصطفی مدظلہ
امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت (کراچی)

ناشر
مکتبہ رشیدیہ
بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

کتاب : میرے اکابر
بہ قلم : مولانا اشرف علی تھانویؒ
مرتب : مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ مدظلہ
طابع : المخزن پرنٹرز
اہتمام : تنویر احمد شریفی
ناشر : مکتبۂ رشیدیہ
بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی
فون: +92-21-32767232

ملنے کے پتے:
مکتبۂ طیبہ، علامہ محمد یوسف بنوریؒ ٹاؤن، کراچی
ادارۃ المعارف، احاطۂ جامعہ دار العلوم، کراچی
مجیدیہ کتب خانہ، اردو بازار، ملتان
مکتبۂ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار، راول پنڈی
مکتبۂ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

فہرست مضامین

عرضِ مرتب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

''عالمی مجلس تحفظ ختمِ نبوّت'' کے امیر مرکزیہ حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی نوّراللہ مرقدہٗ نے ایک حج کے سفر میں دورانِ گفتگو فرمایا تھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات: ۹ر جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ/ ۱۰ر اگست ۱۹۰۵ء)، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی (وفات: ۱۸ر ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء)، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری (وفات: ۱۵ر ربیع الاوّل ۱۳۴۶ھ/ ۱۲ر ستمبر ۱۹۲۷ء) نوّراللہ مرقدہم ہرسہ حضرات کی وفات پر اپنے تأثرات پر مشتمل مضامین لکھے، جو بالترتیب ''یادِ یاراں''، ''ذکرِ محمود'' اور ''خوانِ خلیل'' کے نام سے شایع ہوئے ہیں، اب وہ نایاب ہیں۔ کسی لایبریری سے تلاش کر کے ان کو چھاپ دیا جائے تو علما اور طلبا کا بہت فایدہ ہوگا۔

اسی اثنا میں ایک بار جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی کے کتب خانے میں کتابوں کی سیر کر رہا تھا کہ دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ حضرتؒ نے جن رسائل کی نشان دہی فرمائی تھی ان کو تلاش کیا جائے۔ اس موضوع پر تصنیف شدہ کتب کی الماری میں موجود ہر ایک کتاب کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ مطلوبہ

رسائل میں سے ایک رسالہ ''خوانِ خلیل'' مجھے مل گیا۔ ابھی دو رسائل کی تلاش باقی تھی، کچھ عرصے بعد مکتبۂ رشیدیہ، اُردو بازار، کراچی کا رُخ کیا، وہاں اکابر دیوبند کی کتب مطلوب تھیں، انہیں رسائل کے متعلق مولانا تنویر احمد شریفی حفظہ اللہ سے گفت وشنید ہوئی، انہوں نے فرمایا: یہ رسائل میرے پاس موجود ہیں، میں ان کی فوٹو اسٹیٹ آپ کو بھجوادوں گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، انہوں نے نہ صرف یہ دونوں رسائل بھجوائے بلکہ ایک رسالہ ''وصل الحبیب'' تالیف حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ بھی فوٹو اسٹیٹ بھیج دیا، جس میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ کی زندگی کے آخری لمحات اور ان کی نمازِ جنازہ کی آنکھوں دیکھی صورتِ حال کا ذکر ہے، اور حضرتؒ کے ہاتھ کا تحریر کردہ وصیت نامہ بھی درج کیا ہے، اور اس کے بعد ایک اور رسالہ ''گنجِ بے رنج'' تالیف حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ بھی ارسال کیا تھا۔ اب ان تمام رسائل کو نئی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور نئی ترتیب کے ساتھ ''میرے اکابرؒ'' کے نام سے یک جا شائع کیا جا رہا ہے۔

''خوانِ خلیل'' پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نوّر اللہ مرقدہٗ کا حاشیہ اور آخر میں مختصراً حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے حالات بھی اسی رسالے کا حصہ ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنے ان اکابر کے نقشِ قدم پر چلنے، ان کے رہنما اُصولوں کو اپنانے اور ان کو نصب العین بنانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ زندگی میں دینی اقدار، دینی خدمات اور علم وعمل میں ان جیسی جدوجہد، ان جیسا خلوص واخلاص اور ہمت وطاقت سے نوازے اور آخرت میں ان کے ساتھ محشور

فرمائے۔ آمین!

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

محمد اعجاز مصطفیٰ
(نائب مدیر ماہ نامہ ''بینات'' کراچی)

عرض مزید:

زیر نگاہ رسائل میں مشکل الفاظ کے معانی بھی قوسین میں شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ذیلی عنوانات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ قدیم اردو کو مروجہ طریق ادا پر لکھا گیا ہے۔ جہاں ہجری تاریخ یا سن لکھا ہوا ہے وہیں شمسی تاریخ وسن کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

شریفی
۴ر رجب المرجب ۱۴۳۶ھ/ ۲۴ر اپریل ۲۰۱۵ء

امام ربانی، فقیہ النفس، محدثِ عصر

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز

کے حالات و کمالات اور بعض خدمات پر ایک نظر!

یادِ یاراں

یادگار قلم

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

ناشر

مکتبہ رشیدیہ

بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

یادِ یاراں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

باز گو از نجد واز یارانِ نجد
یاد یاراں یار را میمون بود
تا درو دِیوار را آری بہ وجد
خاصہ کان لیلیٰ وایں مجنوں بوَد

تمہید:

یہ چند سطورِ بے سروپا حضرت قطب العارفین، کہف الطالبین مولانا رشید احمد المحدث الفقیہ الصوفی قدس اللہ سرہ السامی کے تذکرے میں ہیں، جو بے خوض وتأمل اس ناکارہ سیہ نامہ کے ذہن میں بے تکلف حاضر ہوا۔ منشا اِس کا صرف ”من أحبّ شیئًا اکثر ذکرہ“ ہے، اور غایت اس کی طالب سبیلِ حق کو ایک نمونہ اِہتدا و اِقتدا کے لیے دِکھلانا ہے وبس! اِس لیے اُمید ہے کہ عنوان کی بے ربطی پر اِلتفات نہ فرما کر اصل معنون سے منتفع ہونے پر نظر رکھی جاے گی۔

پہلی زیارت اور اُس کا اثر:

تذکرہ نمبر ۱: سب سے اوّل اس نااہل کو اُس مرکزِ دایرۂ اِرشاد کی زیارت

اُس وقت ہوئی جب میں مدرسۂ دیوبند میں پڑھتا تھا، اور وہاں حضرتؒ اپنی تشریف آوری سے اہلِ مدرسہ واہلِ شہر کو گاہ گاہ مشرف فرمایا کرتے تھے۔ سن یاد نہیں رہا۔ دیکھنے سے میرے قلب میں جو عقیدت ومحبت پیدا ہوئی وہ میرے لیے باعث اس کی ہوئی کہ باوجود حقیقت وغایت بیعت کی نہ سمجھنے کے میں نے بیعت کی درخواست کی۔ چوں کہ طبیبِ حاذق کو مریض کی رائے کا اِتباع ضرور نہیں، بلکہ اگر ایسا کیا جائے تو مریض کے لیے مضر بھی ہے، اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا کہ

”جب تک علم سے فراغ نہ ہوجائے اُس وقت تک ایسا خیال وسوسۂ شیطانی ہے۔“

اُس وقت میری سمجھ میں اس جواب کی حقیقت اور عظمت اور حکمت مطلق نہ آئی اور غلط فہمی سے اس کو دفع الوقتی پر محمول کیا، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب حضرتؒ کے اعلیٰ درجے کی شانِ اِرشاد وتربیت کی دلیل ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں بیعت کے نقصانات:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ شیطان کا اصل مقصود اِنسان کو ضرر پہنچانا ہے، اور ضرر کچھ معصیت ہی میں منحصر نہیں، اگرچہ وہ اعلیٰ درجے کا ضرر ہے لیکن ایک فرد ضرر کی یہ بھی ہے کہ کسی طاعت سے اور اُس کے ثواب سے محروم کردے، گو اُس سے کم درجہ طاعت میں مشغول کردینے ہی سے کیوں نہ ہو۔ پس ضررِ قسم اوّل کا اِدراک تو اکثر صلحا بلکہ عامۂ مسلمین کو بھی ہوجاتا ہے، لیکن دُوسری قسم کے ضرر کا اِدراک کرنا مخصوص ہے محققین بلکہ صدیقین کے ساتھ۔ اسی لیے حدیث میں ہے:

”فقیہ واحد أشدّ علی الشّیطان من الف عابد“

(مشکوٰۃ: ص ۳۴)

''فقیہ'' ایسے ہی شخص کو کہتے ہیں جو حقایق و علل خفیہ و دقیقہ کو سمجھ سکے۔ پس شیطان اس طریقۂ اِغوا کو بڑی گہری نظر کے بعد تجویز کرتا ہے، اور واقع میں ہے بھی گہری بات، کیوں کہ جہاں گناہ کرا سکنے پر قادر ہونے میں کامیابی کی اُمید نہ ہو وہاں نقص ثواب ہی کو غنیمت سمجھنا نہایت گہرے درجے کی عداوت ہے، اور یہ فقیہِ مبصر نورِ وَہبی سے اس کا اِدراک کر کے اس کی قلعی کھول دیتا ہے اور اُس کا بنا بنایا منصوبہ ایک دم میں غلط کرتا ہے۔ پس اُس پر نہایت درجے شاق ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ تحصیلِ علومِ دِینیہ بہ وجہ اس کے کہ خود بھی انسان کے لیے بہت مواقع زَلّت میں آلۂ ہدایت ہے، و نیز اس وجہ سے کہ اس کا نفع متعدی بھی ہے۔ لا ریب! کثرتِ اَوراد و نوافل و نحوہا سے افضل ہے، اور تجربے سے یہ بات بھی تقریباً متیقّن ہے کہ بیعت کے خواصِ لازمہ عادیہ سے ہے کہ اُس کے بعد اِن اُمور کی طرف میلان و رغبت کی زیادتی ہوتی ہے، اور عقلی مسئلہ ہے کہ

''النّفس لا تتوجّه إلى شيئين في آنٍ واحدٍ''

پس اس مجموعے کا لازمی نتیجہ علومِ دِینیہ سے بے رغبتی ہوتا ہے، اور کسی اَمر کی تکمیل بلا رغبت ہوتی نہیں۔ پس ضرور ایسی حالت میں علم ناقص رہے گا، جس پر کبھی تو بہ وجہ جہل بعض اُمورِ ضروریہ کے ضررِ اِعتقادی یا عملی مرتب ہو جاتا ہے، جو ضررِ قسمِ اوّل ہے، اور اَقل درجے طاعتِ اعظم سے حرمان تو ضرور ہی ہوتا ہے، جو ضررِ قسمِ دوم ہے۔

اس مضمون کی بعضی مثالیں حضرت قطب الوقت ابن عطا اسکندریؒ نے اپنے رسالے ''تنویر'' میں خوب لکھی، اور اسی مضمون میں حضرت عارف مسعود بکؒ فرماتے ہیں:

اے قوم بہ حج رفتہ کجاید کجاید
معشوق دریں جاست بہ یاید بہ یاید

سو اس میں خطابِ عام نہیں ہے بلکہ صرف خاص اُن کو ہے جن پر حج فرض نہیں، اور اُس سے زیادہ ضروری طاعت اصلاحِ نفس کو چھوڑ کر حج کو جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے حضرت قدس سرہٗ کے جوابِ باصواب کی۔ فللّٰہ درہ وللّٰہ برہ!

باوقعت شخصیت:

تذکرہ نمبر ۲: جب اس احقر کا گنگوہ نکاح ہوا، غالباً ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) تھا، والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم ابن عالی جناب حافظ عبدالکریم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ، کہ والد مرحوم اُن کی ریاست میں مختار تھے، شادی میں شامل ہونے کے لیے میرٹھ سے تشریف لائے تھے اور گنگوہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ نکاح حضرت قدس اللہ سرہٗ نے پڑھا تھا، جب حضرتؒ مجلسِ نکاح سے تشریف لے گئے تو شیخ غلام محی الدین صاحب مرحوم بھی ساتھ ہو لیے۔ ایک موقع پر خود احقر سے بیان فرمایا کہ

> ''میں نے بہت سے بزرگ دیکھے، بڑے بڑے حکام سے ملا اور بات چیت کی، لیکن جو رُعب و ہیبت حضرت کی دیکھی، کسی میں نہیں دیکھی۔ یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ بڑی مشکل سے اتنی جرأت ہوئی کہ نذر پیش کر سکا۔''

یہ شیخ صاحب مردُم شناسی و عالی حوصلگی میں مسلّم و معروف تھے۔ اُن کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت ہے۔ اسی ہیبت کے باب میں کہا ہے: ع

ہیبت حق ست وایں از خلق نیست

حق پرستی:

تذکرہ نمبر ۳: حق پرستی کی یہ شان تھی کہ ایک بار میرٹھ سے حضرت قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں ایک اِستفتا گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ حافظ محمد امیر دہلوی مرحوم، اِمام جامع مسجد لال کورتی، میرٹھ نے رمضان کے عشرۂ اخیرہ حالتِ اِعتکاف میں میاں بھورے خزانچی کوٹھی جناب شیخ الٰہی بخش صاحب کو کچھ زیور نونگہ یا جوش بلوانے کے واسطے دیا، وہ مسجد میں وضو کرنے کے سایبان میں ایک الماری میں رکھ کر وضو کرنے لگے، اور وضو کر کے اُس کو بھول کر چلے گئے، پھر جو آ کر دیکھا تو نہ دارد۔ اِمام صاحب اور خزانچی صاحب میں اِختلاف ہوا، حضرتؒ کے یہاں سوال بھیجا گیا، حضرتؒ نے قاعدۂ کلیہ سے جواب تحریر فرمادیا کہ یہ شخص امین ہے اور کوئی تعدی اُنہوں نے امانت میں نہیں کی، اِس لیے ضمان لازم نہ آئے گا۔ اِتفاق سے یہ احقر کان پور جاتا ہوا میرٹھ اُترا، اِن صاحبوں نے مجھ سے بھی سوال کیا، میں نے کتاب نہ ہونے کا عذر کیا اور صرف سوال کی نقل لے کر کان پور چلا گیا، اور وہاں طحطاوی میں ایک جزئیہ ملا کہ اگر اَمین رکھ کر بھول کر کھڑا ہو جائے تو یہ نسیان عذر نہیں۔ میں نے اِس جزیے کے موافق جواب لکھ کر بھیج دیا۔ پھر جو ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے وہ جواب حضرت قدس اللہ سرہٗ کے ملاحظے کے لیے بھیجا تھا، حضرتؒ نے اس کی تصحیح اور جوابِ سابق سے رُجوع کی تصریح تحریر فرمادی۔ سبحان اللہ! حق پرستی کی کیا شان تھی۔

تذکرہ نمبر ۴: میں نے دیو بند میں مولوی ضیاء الحق مرحوم، داماد حضرت مولانا رفیع الدین مرحوم مہتمم مدرسہ کے پاس چند سوالات کے جواب حضرت قدس اللہ سرہٗ کے لکھے ہوئے دیکھے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ بچے کو نزع کی تکلیف کیوں

ہوتی ہے؟ اُس پر حضرتؒ کا یہ جواب لکھا ہوا تھا کہ ''مجھ کو تحقیق نہیں''۔ سبحان اللہ!
وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾ (سورۂ ص:۸۶) پر عمل اس کو کہتے ہیں۔

دین کے لیے شفقت:

تذکرہ نمبر ۵: جب والد مرحوم کا ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں انتقال ہوا، میں نے کچھ سوالات متعلقہ جائیدادِ ترکہ کے حجام کے ہاتھ حضرت قدس اللہ سرہٗ کی حضور میں بھیجے اور جلدی جواب عطا فرمانے کے لیے عرض کر دیا۔ سوال بہت سے تھے، اور اِتفاق سے اُس وقت حضرتؒ کو آشوبِ چشم کی تکلیف تھی، مگر اللہ رے دِین کی خدمت اور اَحکام کی اِشاعت کہ اُس حالت میں سب جواب تحریر فرما دیے، اور اِختصارِ اَجوِبہ کی وجہ میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ

> ''آشوبِ چشم میں مبتلا ہوں، چناں چہ چشمِ بند کردہ جواب لکھ رہا ہوں''۔

دِین کے لیے ایسی شفقت گوارا کرنا، اللہ و رسول کی سچی محبت یہ ہے۔

کرامتِ عظمیٰ:

تذکرہ نمبر ۶: میں نے اُسی واقعے کے متعلق یہ رائے بھی لی تھی کہ اگر جائیداد نہ رکھوں تو کیسا ہے؟ حضرت قدس اللہ سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ

> ''اگر رکھو رُخصت ہے، اور اگر نہ رکھو جب بھی حق تعالیٰ روزی سے تم کو کبھی پریشان نہ کرے گا''۔

چناں چہ بفضلہٖ تعالیٰ اب تک جس آرام سے یہ نالایق بسر کر رہا ہے ہرگز اس لایق نہ تھا۔ یہ حضرتؒ کی صریح کرامت ہے، خواہ حسیہ: اگر کہا جائے کہ آپ کو کشف ہوا تھا، یا معنویہ: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ پر اِعتمادِ کامل کر کے فرما دیا تھا۔ ایسا اِعتماد کشف سے ہزار ہا درجے بڑھ کر کرامتِ عظمیٰ ہے۔

کامل اِتباعِ سنت:

تذکرہ نمبر ۷: میں جب ۱۳۱۰ھ یا ۱۳۱۱ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) میں عازم سفرِ حجاز ہوا تو ایک بار حاضری کے بعد مکرّر عین وقت پر عریضے کے ذریعے سے حضرت قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں اپنی تیاریٔ سفر کی اطلاع کی، حضرتؒ کا جو جواب آیا اُس میں لکھا تھا کہ

''وہاں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچ کر مجھ کو بھی یاد رکھنا!''

اور یہ شعر تحریر فرمایا:

چو باحبیب نشینی وبادہ پیمائی
بہ یاد آر حریفاں بادہ پیما را

اس سے حضرت قدس اللہ سرہٗ کا کمالِ تواضع ظاہر ہے کہ ایسے نااہل سے ایسی فرمائش۔ یہ قصہ بعینہٖ مشابہ اُس کے ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت عمرے کی مانگی، آپ نے اِرشاد فرمایا:

''اے میرے بھائی! ہم کو بھی دُعا میں شریک کرنا بھولنا مت۔''

پس تواضع کے ساتھ کمالِ اِتباعِ سنت بھی اِس قصے سے ثابت ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے متعلق حضرت حاجی صاحبؒ کا اِرشاد:

تذکرہ نمبر ۸: جب میں مکۂ معظّمہ سے چلنے لگا تو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ

''مولانا رشید احمد صاحب سے کہہ دینا کہ آپ کے مخالف لوگ یہاں آکر طرح طرح کی باتیں لگاتے ہیں، مگر آپ اِطمینان رکھیں، یہاں

اُن کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ہماری آپ کی محبت اللہ کے واسطے ہے، اور جب اللہ باقی ہے اسی طرح جو محبت اللہ کے لیے ہوتی ہے وہ بھی باقی ہوتی ہے، اور میں نے جو'ضیاء القلوب' میں آپ کی نسبت کچھ لکھا ہے وہ اِلہام سے لکھا ہے۔ کیا میرا وہ علم اب بدل جائے گا؟(۱)''۔

چناں چہ احقر نے واپس آکر سب ملفوظات عرض کر دیے۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا:

''بھائی! ہم تو توکل کیے بیٹھے ہیں!''

اس سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں جو گنجایش حضرت مولاناؒ کی تھی اور جو اِس شہادت سے ظاہر ہوتا ہے، ظاہر ہے، اور ایسے شیخِ کامل کی شہادت ظاہر ہے کیا وقعت رکھتی ہے۔

فقاہت اور قوت استنباط:

تذکرہ نمبر ۹: پیشاب کر کے جو کلوخ سے اِستنجا خشک کرتے ہیں، میں یہ سمجھتا تھا کہ کسی حدیثِ مرفوع سے اس کا ثبوت نہیں۔ ایک بار حضرتؒ سے دریافت کیا، آپ نے فوراً اِستدلال میں یہ حدیثِ مرفوع پڑھ دی:

"إستنزهوا من البول"

اور کلوخ لینا یقیناً اِستنزاہ میں داخل ہے، پس بالکل اطمینان ہوگیا۔ اس واقعے سے حضرت قدس اللہ سرہٗ کی فقاہت اور قوّتِ اِستنباط اَظہر من الشّمس ہے۔

تذکرہ نمبر ۱۰: ایک بار میں نے، یا میرے سامنے کسی اور نے یہ پوچھا کہ

---

(۱) یہاں مخالفین سے مبتدعین مراد ہیں۔ مولانا عبدالسمیع صاحب مرحوم جو اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ بھی تھے، انہوں نے ''انوار ساطعہ'' نامی کتاب لکھ کر حضرت گنگوہیؒ کے بعض عقائد سے اختلاف کیا تھا۔ اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ نے انہیں منع بھی فرمایا تھا، لیکن مولانا عبدالسمیع صاحب اپنے من کے آدمی تھے۔(اعجاز)

''یاجوج وماجوج اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں یا نہیں؟'' فوراً اِرشاد فرمایا کہ ''جانتے ہیں''، اور اِستنباط میں وہ حدیث ارشاد فرمادی کہ جب نکلنے کا وقت مقدّر آئے گا تو دیوار کھود کر کہیں گے کہ ''اِن شاءَ اللہ تعالیٰ کل یہاں سے نکل جائیں گے''۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو جانتے ہیں۔

تذکرہ نمبر ۱۱: تشہد میں جو رَفعِ سبابہ(۱) کیا جاتا ہے، اس میں تردّد تھا کہ اس اِشارے کا بقا کس وقت تک کسی حدیث میں منقول ہے یا نہیں؟ حضرت قدس اللہ سرہٗ کی حضور میں پیش کیا گیا، فوراً اِرشاد فرمایا کہ

> ''ترمذی کی کتاب الدعوات میں حدیث ہے کہ آپ نے تشہد کے بعد فلاں دُعا پڑھی، اور اُس میں سبابہ سے اِشارہ فرمارہے تھے، اور ظاہر ہے کہ دُعا قریب سلام کے پڑھی جاتی ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اَخیر تک اُس کا باقی رکھنا حدیث میں منقول ہے۔''

اس سے بھی سرعتِ اِنتقالِ ذہنی اور ملکۂ اِستنباط بہ خوبی روشن ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ

> ''لوگ اس مسئلے کو بابُ التشہد میں ڈھونڈتے ہیں اور وہاں ملتا نہیں، اس سے سمجھتے ہیں کہ حدیث میں نہیں ہے''۔

جنگل میں رہنا پسندیدہ نہیں!

تذکرہ نمبر ۱۲: ایک بار بعض وجوہِ خاصہ سے آبادی سے الگ خلوَت اِختیار کرنے کی پسندیدگی حضرت قدس سرہٗ کی حضور میں عرض کی گئی، فرمایا کہ

> ''ہمارے بزرگوں نے جنگل میں رہنا پسند نہیں کیا۔''

اس میں اِرشاد ہے مصلحت کی طرف، اور تنبیہ ہے کیدِ نفس پر۔ کیوں کہ بعض

---

(۱) اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا اور حلقہ بنا کر رکھنا۔ (اعجاز)

اوقات نفس کو ایسے خیالات سے وہی اُمور مقصود ہوتے ہیں جو اَحیاناً ایسے افعال پر اَز قبیل مفاسد مرتب ہو جاتے ہیں، یعنی شہرت وعُجب وتحقیرِ خلق۔ اس سے شان اِرشاد اور تربیت کی عیاں ہے، اور اس عنوان سے کہ: ''ہمارے بزرگوں نے ...الخ''، کس قدر تأدّب وتواضع مترشح ہے کہ اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا۔

حضرت گنگوہیؒ کے دو اِحسان:

تذکرہ نمبر ۱۳: (متضمن بعض احساناتِ عظیمہ بریں آلودۂ ادناس ذمیمہ)

حسبِ ارشادِ نبوی:

"من لم یشکر النّاس، لم یشکر الله"۔

یوں تو ہر صحبت اور ہر مخاطبت میں کچھ نہ کچھ فیض واحسان فایض رہتا تھا، لیکن خصوصیت کے ساتھ دو اِحسان زیادہ قابلِ ذِکر ہیں: ایک علمِ ظاہری کے متعلق، دُوسرا باطن کے متعلق۔

اوّل کا مختصر بیان یہ ہے کہ میں مدّت تک مسائل اِختلافیہ میں اہل الحق واہل البدعۃ کے متعلق باوجود صحتِ عقیدہ کے (والحمدللہ!) ایک غلطی میں مبتلا رہا، اور اُس غلطی پر بہت سے خیالات اور بہت سے اعمال متفرّع رہے، یعنی بعض اعمالِ رسمیہ مثل مجلس متعارف میلاد شریف وامثالہٖ سے جو محققین بعض مفاسد کی وجہ سے عوام الناس کو مطلقاً اور اُن عوام الناس کے ساتھ خواص کو بھی روکتے ہیں۔ اُن مفاسد کو تو میں ہمیشہ مذموم اور اُن کے مباشِر کو ہمیشہ ملوم سمجھتا تھا، اور یہ صحت عقیدے کی تھی، اور عوام الناس کو ہمیشہ اُن مفاسد پر متنبہ اور مطلع کرتا رہتا تھا، لیکن یہ بات میرے خیال میں جم رہی تھی کہ علت نہی کی وہ مفاسد ہیں، جہاں علت نہ ہوگی معلول بھی نہ ہوگا۔ پس خواص جو کہ اُن مفاسد سے مبرا ہیں اُن کو روکنے کی ضرورت نہیں، اور اسی طرح عوام کو بھی علی الاطلاق روکنے کی حاجت

نہیں، بلکہ اُن کو نفسِ اعمال کی اجازت دے کر اُن کے اُن مفاسد کی اصلاح کر دینا چاہیے، بلکہ اِس اجازت دینے میں یہ ترجیح اور مصلحت سمجھتا تھا کہ اس طریق سے تو عقیدے کی بھی اصلاح ہو جائے گی، جس کا فساد مدارِ نہی ہے، اور بالکل منع کر دینے میں عوام مخالف سمجھیں گے اور عقیدے کی اصلاح بھی نہ ہوگی۔

ایک مدّت اس حالت میں گزر گئی اور باوجود دائمی درس وتدریس، فقہ وحدیث وغیرہما کے کبھی ذہن کو اس کے خلاف کی طرف انتقال واِلتفات نہیں ہوا۔ حضرت قدس اللہ سرہٗ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں کہ خود ہی غایت رافت وشفقت سے مولوی منوّر علی صاحب دربھنگوی مرحوم سے اس امر میں میری نسبت تأسف ظاہر فرمایا۔

اور اُسی غلطی کے شعبوں میں سے ایک شعبہ یہ بھی واقع ہوا تھا کہ بعضے درویشوں سے جن کی حالت کا انطباق شریعت پر تکلف سے خالی نہ تھا، میں نے بہ خیال خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرَ بعض اَذکار واَشغال کی تلقین بھی حاصل کر لی تھی، اور آمد ورفت اور صحبت کا بھی اتفاق ہوتا تھا، اور لزومِ مفاسد کی نسبت وہی خیال تھا کہ خواص کے عقائد خود دُرست ہوتے ہیں، وہاں مفسدہ لازم نہیں، اور عوام کو حق وباطل پر تقریراً متنبہ کرتے رہنا دفعِ مفسدہ کے لیے کافی ہے۔ سو حضرتؒ نے خصوصیت کے ساتھ اس پر بھی تأسف ظاہر فرمایا، اور غایت کرم یہ قابل ملاحظہ ہے کہ جیسا حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غایت کرم وحیا سے بالمشافہ کسی پر عتاب نہ فرماتے تھے، اسی طرح حضرت قدس سرہٗ نے باوجود حاضری کرّۃً بعد مرّۃً کے بالمشافہ کبھی اس سے تعرض نہیں فرمایا، اور اس سے زیادہ لطف وکرم یہ کہ اگر کبھی کسی نے اِعتراض کیا تو میرے فعل کی تأویل اور اُس

کو محملِ حسن پر محمول فرمایا۔

اور اُسی غلطی کی ایک فرع یہ تھی کہ حضرت پیر و مرشد قبلہ و کعبہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تقریر در باب ممانعت تنازع و اختلاف مسائل معہودہ میں اِجمالاً اِرشاد فرمائی اور مجھ کو اُس کی تفصیل کا حکم دیا۔ چوں کہ میرے ذہن میں وہی خیال جما ہوا تھا، اُس کی تفصیل بھی اُسی کے موافق عنوان سے حیّزِ تحریر میں لایا اور حضرت حاجی صاحبؒ کی حضور میں اُس کو سنایا۔ چوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہ وجہ لزوم خلوَت وقلّتِ اِختلاط مع العوام و بنا بر غلبۂ حسنِ ظن عوام کے حالت اور جہالت اور ضلالت پر پورا اِلتفات نہ تھا، لامحالہ اُس مفصل تقریر کو پسند فرمایا، اور کہیں کہیں اُس میں اصلاح اور کمی بیشی بھی فرمائی، اور ہر چند کہ وہ عنوان میرا تھا مگر چوں کہ اصل معنون حضرتؒ نے اَز خود اِرشاد فرما کر قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا، لہٰذا حضرتؒ نے اُس تقریر کو اپنی ہی طرف سے لکھوایا اور خود اپنے دستخط و مہر سے مزین فرمایا اور اپنی ہی طرف سے اشاعت کی اجازت دی، جو بہ عنوان ''فیصلۂ ہفت مسئلہ'' شایع کر دیا گیا۔ جس کو بعضے کم سمجھوں (۱) نے اپنی بدعات کا موید سمجھا۔ وَاَنّٰی لَهُمْ ذٰلِكَ!

کیوں کہ اُن مفاسد کا اُس میں بھی صراحتاً رَدّ ہے۔ صرف خوش عقیدہ، خوش فہم لوگوں کو البتہ رُخصت و وسعت اُس میں مذکور ہے، جس کا مبنیٰ وہی خیالِ مذکور ہے کہ عوام کے مفاسد کا خواص پر کیوں اثر پڑے؟

غرض حضرت قدس اللہ سرہٗ نے اس سب کے متعلق مولوی منوّر علی صاحب سے تذکرہ فرمایا۔ مولوی صاحب نے احقر سے ذِکر کیا تو حضرتؒ کے قوّتِ فیضان سے اِجمالاً تو مجھ کو فوراً اپنی غلطی پر تنبہ ہو گیا، لیکن زیادہ بصیرت کے لیے

(۱) بریلوی مکتب فکر مراد ہے۔ (اعجاز)

میں نے اس بارے میں مکاتبت کی بھی ضرورت سمجھی، چناں چہ چند بار جانبین سے تحریرات ہوئیں، اور وہ تحریرات سوانح (تذکرۃ الرشید) میں چھپ چکی ہیں۔ بالجملہ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو بصیرت و تحقیق کے ساتھ اپنی غلطی پر بفضلہٖ تعالیٰ اطلاع ہوگئی، اور اُس پر اِطلاع ہونے سے ایک بابِ عظیم علم کا جو کہ مدّت تک مغلق تھا، مفتوح ہوگیا(۱)۔

جس کا ملخص یہ ہے کہ مدارِ نہی فی الواقع فسادِ عقیدہ ہی ہے، لیکن فسادِ عقیدہ عام ہے، خواہ فاعل اُس کا مباشر ہو خواہ اُس کا سبب ہو۔ پس فاعل اگر جاہل عامی ہے تو خود اُسی کا عقیدہ فاسد ہوگا، اور اگر وہ خواص میں سے ہے تو گو وہ خود صحیح العقیدہ ہو مگر اُس کے سبب سے دُوسرے عوام کا عقیدہ فاسد ہوگا اور فساد کا سبب بننا بھی ممنوع ہے، اور گو تقریر سے اُس فساد پر تنبیہ عوام کی ممکن ہے مگر کُل عوام کی اس سے اصلاح نہیں ہوتی، اور نہ سب تک اس کی تقریر پہنچتی ہے۔ پس اگر کسی عامی نے اس خاص کا فاعل ہونا تو سنا اور اِصلاح کا مضمون اُس تک نہ پہنچا تو یہ شخص اُس عامی کے ضلال کا سبب بن گیا، اور ظاہر ہے کہ اگر ایک کی ضلالت کا بھی کوئی شخص سبب بن جائے تو بُرا ہے، اور ہر چند کہ بعض مصلحتیں بھی فعل میں ہوں۔

لیکن قاعدہ یہ ہے کہ جس فعل میں مصلحت اور مفسدہ دونوں مجتمع ہوں اور وہ فعل شرعاً مطلوب بالذات نہ ہو، وہاں اُس فعل ہی کو ترک کردیا جائے گا۔ پس اس قاعدے کی بنا پر اُن مصلحتوں کی تحصیل کا اہتمام نہ کریں گے بلکہ اُن مفاسد سے اِحتراز کے لیے اُس فعل کو ترک کردیں گے۔ البتہ جو فعل ضروری ہے اور اُس میں مفاسد پیش آئیں، وہاں اُس فعل کو ترک نہ کریں گے بلکہ حتی الامکان اُن

(۱) یہ مکاتبت ضمیمے کے طور پر ''یادِ یاراں'' کے آخر میں شامل کردی گئی ہے۔ (اعجاز)

مفاسد کی اصلاح کی جاے گی۔ چناں چہ احادیثِ نبویہ و مسائلِ فقہیہ سے یہ سب اَحکام و قواعد ظاہر ہیں۔ ماہر پر مخفی نہیں۔ اُن میں سے کسی قدر رسالہ ''اِصلاح الرسوم'' میں بندے نے لکھ بھی دیا ہے۔

جب میرے اِس خیال کی اصلاح ہوگئی تو اس کے سب فروع و آثار کی اصلاح بفضلہٖ تعالیٰ ہوگئی۔ چناں چہ خلافِ شریعت درویشوں کی صحبت و تلقّی سے بھی نجات ہوئی، اور ''فیصلۂ ہفت مسئلہ'' کے متعلق بھی ایک ضروری ضمیمہ لکھ کر شایع کر دیا گیا، جس سے اُس کے متعلق اہلِ افراط و تفریط کے سب اوہام کو رَفع کر دیا گیا۔

اور دُوسرا اِحسان متعلق باطن کے، سو اُس کی تفصیل میں چوں کہ مخفیات کا اِظہار بھی ہے، اور نیز وہ قصہ بھی نہایت دردناک اور ناگوار ہے، اس لیے محض اس اِجمال پر اِکتفا کرتا ہوں کہ میری شامتِ اعمال و کثرتِ معاصی سے مجھ پر ایسی ایک حالتِ شدید طاری ہوئی تھی کہ باوجود صحتِ بدنی کے زندگی سے مایوسی تھی، بلکہ موت کو ہزارہا درجے حیات پر ترجیح دیتا تھا، اور اُس کو اس سے زیادہ عنوان سے تعبیر نہیں کر سکتا کہ ؎

دو گونہ رنج و عذاب ست جان مجنوں را
بلائے فرقتِ لیلیٰ و وُصلتِ لیلیٰ

اُس وقت حضرت قدس سرہٗ نے دُعا و تعلیم و ہمت سے خاص توجہ فرمائی، جس سے ہوش و حواس دُرست ہوئے اور جان میں جان آئی، اور اُس حالت کے طِریان کے اور پھر اُس کے زوال کے منافع بحمداللہ محسوس ہوئے۔ اِن دونوں اِحسانوں کو اُمید ہے کہ عمر بھر نہ بھولوں گا، اور حکم بھی یہی ہے: من لم یشکر النّاس، لم یشکر اللہ!

ہنسی کی کیفیت:

تذکرہ نمبر ۱۴: ایک دقیق کمال حضرت قدس سرہٗ میں یہ پایا کہ کبھی ہنسنے کی آواز نہیں سنی گئی، یا زیادہ کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔

غصّے میں سنت:

تذکرہ نمبر ۱۵: اسی طرح کبھی مغلوب الغضب نہیں پائے گئے، اور یہ دونوں اَمر شعبے ہیں اِتباعِ سنت کے طبعی ہو جانے کا۔

دیہاتیوں کے ساتھ برتاو:

تذکرہ نمبر ۱۶: حدیثوں میں جیسا برتاؤ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیہاتیوں کے ساتھ آیا ہے، اُس کا نمونہ حضرت قدس اللہ سرہٗ میں دیکھا کرتے تھے۔

ذِکر زیادہ باتیں کم:

تذکرہ نمبر ۱۷: قلّتِ کلام اور کثرتِ ذِکر کے مفہوم کا مصداق اِتباعِ سنت کے حدود کے ساتھ کسی نے حضرت قدس سرہٗ کے برابر کہیں کم دیکھا ہوگا۔

تذکرہ نمبر ۱۸: - خوش مزاجی وقار کے ساتھ حضرت قدس سرہٗ میں عجیب لطافت کے ساتھ پائی جاتی تھی۔

دِل جوئی کرنا اور تسلی دینا:

تذکرہ نمبر ۱۹: دِل جوئی اور تسلی جس بلیغ اور سلیس طرز پر حضرت قدس سرہٗ میں دیکھی، بہت کم اُس کی نظیر پائی جاسکتی ہے۔ ایک بار ایک شخص نے اپنا خواب عرض کیا تھا کہ گویا آپ کی وفات ہوگئی ہے اور اِس خواب نے اُس کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ آپ نے نہایت بے ساختگی سے ارشاد فرمایا کہ

”بھائی! تمہارے سامنے زندہ تو بیٹھا ہوں، اور آخر کبھی تو مروں ہی
گا، مگر یہ کیا ضرور ہے کہ خواب کے ساتھ ساتھ تعبیر بھی واقع
ہوجائے؟“

ذِکر کی کثرت کا نتیجہ:

تذکرہ نمبر ۲۰: قدرتی طور پر، اور میرا گمان یہ ہے کہ کچھ کثرتِ ذِکر سے مزاج میں لطافت اور ذکائے حس اس درجے تھی کہ ادنا اَمرِ موذی سے متاذّی ہوتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ضبط اس کمال کا تھا کہ جہاں اِظہار سے کسی کی تاذّی کا احتمال ہوتا تحمّل فرماتے تھے۔

خدام میں اِتحاد پسند تھا:

تذکرہ نمبر ۲۱: اپنے خدام اور منتسبین میں اِتفاق کو بہت محبوب رکھتے اور کبھی کسی کی شکر رَنجی کی اطلاع ہوتی تو توافق میں سعی فرماتے۔

تذکرہ نمبر ۲۲: اپنے مخلصین کے ساتھ حسنِ ظن نہایت درجے رکھتے۔

تذکرہ نمبر ۲۳: اِستقلال اس درجے تھا کہ بڑے بڑے حوادث سے از جارفتہ نہ ہوتے۔

ہیبتِ خداداد:

تذکرہ نمبر ۲۴: ہیبتِ خداداد اس درجے تھی کہ باوجود آپ کی غایت خوش اخلاقی ونرم مزاجی کے بڑے بڑے ہمت وجرأت والوں کا حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ آپ کے سامنے زیادہ کلام کرسکیں۔

حضرت گنگوہیؒ کی صحبت کی برکات:

تذکرہ نمبر ۲۵: آپ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی

کثرت ہو، جوں ہی آپ کی صحبت میں بیٹھے اور قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوئی، جس سے سب کدورات رفع ہوگئیں، اور قریب قریب آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی دُرستی، دِین کی پختگی، خصوص حب فی اللہ و بغض فی اللہ بہ درجۂ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب برکت آپ کی صحبت کی ہے، اور اِن کمالات کی شہادت میں بے شمار واقعات موجود و مشہور ہیں۔

''رحمۃ اللہ علیہ'' اور ''قدس سرّہٗ'' کی عجیب تفسیر:

تذکرہ نمبر ۲۶: یہ بعض واقعات و کمالات حضرت قدس سرہٗ کے متعلق عالمِ یقظہ کے ہیں، اور عالمِ رُویا میں بھی بعض اُمورِ مبشرہ معلوم ہوئے۔ گو اس احقر کاذب الاقوال و کاذب الاحوال کے اکثر خواب بھی میرے قال و حال ہی کے مثل ہیں، اور وہ کسی طرح اِستناد و اِعتماد کے قابل نہیں، مگر محض دوستوں کے جی خوش کرنے کے لیے حضرتؒ کے متعلق اپنے دو خواب ذِکر کرتا ہوں۔ ایک حضرت کی حیات میں دیکھا تھا، اور ایک بعد وفات!

خواب اوّل یہ ہے کہ کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ ''حضرت مولانا رشید احمد صاحب قطب ہیں''، یا یوں کہا: ''قطب الارشاد ہیں۔''

دُوسرا جو بعد وفات دیکھا یہ ہے کہ میں نے حضرتؒ کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہا تو کسی نے یوں کہا کہ ''نہیں! قدس سرہٗ یا قدس اللہ سرہٗ کہو۔''

خوابِ اوّل تو محتاجِ تعبیر نہیں، اس لیے صرف دُوسرے خواب کے معنی حسب اپنے فہم کے لکھتا ہوں کہ اس خواب کا یہ مطلب نہیں کہ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہنا ممنوع ہے، یا یہ کہ ''رحمۃ اللہ علیہ'' اپنے مفہوم میں ''قدس سرہٗ'' سے گھٹا ہوا ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ بعض اوقات الفاظ و عبارات متحدۃ المعنی میں حسب عرف کچھ تمائز اور تغائر بھی ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ اِسی بناپر ''صلی اللہ علیہ وسلم'' بجز انبیا

کے کسی کے لیے اطلاق نہیں کیا جاتا۔ ''رضی اللہ عنہ'' اس وقت بجز سلف کے کسی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ پس اسی طرح اس وقت عرفاً ''رحمۃ اللہ علیہ'' عموماً صلحا کے لیے بولا جاتا ہے، اور ''قدس سرہٗ'' خاص اکابر اولیا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پس مقصود اس سے تنبیہ ہے کہ حضرتؒ اس درجے کے اکابر میں سے ہیں۔ واللہ اعلم!

تذکرہ نمبر ۲۷: حضرت قدس سرہٗ کی بعض تحریرات عام اور خاص مضامین کی بھی میرے پاس تھیں، جو میں نے مکرمی مولانا محمد یحییٰ صاحب (۱) کو دے دی تھیں، جن میں بعض خاص دستِ مبارک کی لکھی ہوئی ہیں، اور بعض بعد معذوریٔ بصر کے دیگر خواص معتمدین سے لکھوائی ہوئی ہیں۔ چوں کہ مولوی صاحب بہ شرطِ مصلحت اُن کی اِشاعت فرما سکتے ہیں، لہٰذا میں نے ان اوراق میں اُس کو شامل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

تذکرہ نمبر ۲۸: اخیر میں یہ بات بھی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتی ہے کہ بعض حضرات کو قلّتِ فہم یا غلبۂ حسد کی وجہ سے حضرتؒ پر کچھ اِعتراضات بھی ہیں (۲)، مگر اُن سب اِعتراضات کے مبادی اور مناشی اعلیٰ درجے کے کمالات ہیں، جو حسب قولِ سعدیؒ: ع

عیب نماید ہنرش در نظر!

بعض کو بہ شکل اِعتراض نظر آتے ہیں۔ اُن سب کا جواب یہ ہے:

ولا عَیبَ فیھِمْ غیرَ انّ سُیُوفَھُم
بھنّ فلولٌ مِنْ قراعِ الکتائبِ

---

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے والد گرامی۔ (اعجاز)

(۲) وہی بریلوی مکتب فکر مراد ہے۔ (اعجاز)

مادۂ تاریخِ وفات:

تذکرہ ۲۹: حضرت قدس سرہٗ کی وفات کا تاریخی مادہ احقر کے خیال میں یہ آیا تھا: مولانا عاش حمیدًا مات شہیدًا، جس سے ۱۳۲۳ھ نکلتا ہے۔

تذکرہ نمبر ۳۰: چوں کہ حضرت قدس سرہٗ کے خواص اور اَخص الخواص سوانح مبارکہ لکھنے پر متوجہ ہیں، جو علم میں، اطلاع میں، فہم میں، تحقیق میں درجۂ علیا رکھتے ہیں اور جن کے ساتھ خود اس ناکارہ کو نسبتِ خادمیت و نیاز مندی ہے، اس لیے اس قدر لکھنا بھی اگر بعض مُخلِّص (۱) احباب کی حکم برداری اور خود بھی شمولِ برکت کی اُمید نہ ہوتی تو غیر ضروری اور خلافِ ادب تھا۔

یکم ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ (۱۶ر جنوری ۱۹۰۷ء)

(۱) مراد اس سے مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی ہیں۔ مولانا موصوفؒ نے ''تذکرۃ الرشید'' کے نام سے نہایت تفصیلی حالات لکھے ہیں۔

آج چراغِ دِین بجھ گیا

۱۳۲۳ھ

قطعۂ تاریخِ رحلت رأس المحدثین، سلطان العارفین حضرت جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ

حامیٔ دِینِ احمدِ مرسل	واقفِ رمزِ قادرِ مطلق
ہادیٔ اہلِ شرع واہلِ ورَع	رہبرِ دِین وملتِ برحق
عالمِ علمِ ظاہر وباطن	جن سے لیتی تھی عقلِ کُل بھی سبق
اہلِ ہوش آپ کی ہدایت سے	کرتے تھے امتیازِ باطل وحق
حل کیے مسئلے وہ حضرتؒ نے	علما جن کو جانتے تھے ادق
کشورِ زہد وملکِ عرفاں کا	آپؒ کی ذات سے تھا نظم ونسق
آپؒ کے فیض اور افادت سے	ہوئے مطلوب تھے جو طالبِ حق
کبھی ساکت مراقبے میں مرید	کبھی مستانہ نعرۂ ہو حق
حضرتِ مولوی رشید احمد	حق تھا اُن کی طرف وہ جانبِ حق
گئے دُنیا سے سوئے دارِ بقا	اُن کی رحلت کا ہے جہاں کو قلق
خاک سر پر اُڑا رہی ہے صبا	رنگ چہرے کا ہے گاون کے فق
آنکھیں ہیں قدسیوں کی بھی خوں بار	کہہ رہی ہے یہ آسمان کی شفق

مثلِ برگِ گلِ خزاں دیدہ ہیں پریشان کتابِ دِل کے ورق
صیغۂ آہ وصیغۂ فریاد مصدرِ غم سے دونوں ہیں مشتق
کیا کرے کوئی شرح اِس غم کی سینۂ کلک وزبان بھی ہے شق
سال رحلت میں فکر کشتہ کا تھا بہت بے قرار مستغرق

بول اُٹھا دِل زروئے حزن والم
ہوئے مرشدِ رشید واصلِ حق
۱۳ ھ ۲۳

راقم کشتہ دیوبندی
مقیم فتح گڑھ

ضمیمہ-۱

تمہید

از: حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھیؒ

سب سے مقدم اس مراسلے کا ہدیہ ناظرین کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اور مولانا الحافظ الحاج القاری شاہ اشرف علی تھانوی مدظلہٗ کے مابین ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۷ء) میں پیش آیا۔ چوں کہ علامۂ زمن مولانا اشرف علی صاحب زید مجدہٗ کا تبحر علمی ہندوستان کے ہر ہر عالم کو تسلیم ہے، اس لیے شکوک وشبہات کی تقویت اسی سے اندازہ ہوسکتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی مولانا تھانوی دام ظلہٗ کا وہ طبعی خدا داد جوہر قابل لحاظ ہے جس کو سلامتیٔ قلب، اطاعت حق، فروتنی وہیچمدانی اور سچا اسلام یعنی گردن نہادن بہ طاعت کہا جاتا ہے۔ آپ کا رجوع الی الحق جو تکبر ونخوت علمی سے بے لوثی کی علامت اور برحق علم کے سچے اثر کا ثمرہ ہے، آپ کے کمال کو اس حد تک پہنچا رہا ہے کہ واللہ العظیم! مولانا تھانویؒ کے پاؤں دھوکر پینا نجات اخروی کا سبب ہے۔ یہ امتثال واذعان کی مثال علمائے زمانہ کے لیے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ پائیدار یادگار رہے جو مردہ سنت کے زندہ کرنے میں اس چودھویں صدی کے اندر سب سے پہلے مولانا کے ہاتھوں ظاہر ہوئی۔ چوں کہ مولانا تھانویؒ میرے عقیدے میں سرتاج علما ہونے کے علاوہ خود میرے محترم پیش وا اور دینی آقا ہیں، اس لیے اس پاکیزہ تحریر کو جوان شاء اللہ قیامت کے ہول ناک دن میں مغفرت کی دستاویز اور قلبی

سلامتی وایمان کی مہری سند بنا کر علی رؤس الاشہاد مولانا کے ہاتھ میں دی جائے گی، سوانح میں شائع کرتا ہوں، تاکہ احیائے سنت ممیتہ کی کسی درجے میں تائید کا حصہ مجھ ناکارہ کو بھی مل جائے اور تھانوی آقا کی کسی ادنا مرتبے میں حشر کے دن مجھے بھی معیت نصیب ہو جائے......

پہلا مکتوب از حضرت تھانویؒ،

نظر وفکر کا اظہار:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ تعالیٰ، والسلام علی رسولہ الافضل الاعلی، اما بعد من العبد الذلیل الی المخدوم المطاع الجلیل!

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ والیکم یشتاق قلبی الاواہ وبعد فقد اجتمعت فی ھذا الایام بالمولوی منور علی فقال ان حضرت مولانا ساخطون علیک لاختیارک طریق بعض اقاربک الذی بغائر طریقھم فعلیک ان تعتذر الیھم وترضیھم فتوجعت بھذا الخبر توجعا فظیعا وتالمت تالما وجیعا لکن مالمت الانفسی وما رایت شیئا غیر الصدق ینجی فیا مولانا واللہ انی کنت فی ذلک الزمان غریقا فی بحار الحیرت والطلب واتطلع الی من یخلصنی من ذاک الوصب والنصب اذ نادی مناد من قریب من غیر ارادتی وقصدی ھات یدک بیدی انجیک من ھذا البحر اللجی وان الغریق یتثبت بکل حشیش

لما هو فيه من التهويش والتشويش وقد كنت من وراء البحار من حبيبى ومغيثى وطبيبى ومع هذا ما تركت بحمد الله يوما العمل بقول الاكابر خذ ما صفا ودع ما كدر ثم كما ساعدنى الجد بلثم تراب نعليه وحضرت لديه جدت الارادة ليكون علما عسى ان يكون فات اعاده فلما رجعت ازددت ظلما واكادا حسب السراب ما ورايتنى لا ازداد الا حيرة ووحشة وضيقا دهشة كتبت الى حبيبى ما وقع من الحال وناديت بالبلبال:ـ

يا مرشدى يا موئلى يا مفزعى
يا ملجائى فى مبدئى ومعادى
ارحم على يا غياث فليس لى
كهفى سوى حبيبكم من زاد
فاز الانام بكم وانى هائم
فانظر الى برحمة يا هاد
يا سيدى للّٰه شيئا انه
انتم لى المجدى وانى جادى

فعذرنى ونصرنى وقال حبا وكرامه واقمنى على ساحل السلامة فرنمت شوقا وتبنيت ذوقا:ـ

دوش وقت سحر از غصہ بہ خاتم دادند
واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
کیمیائی ست عجب بندگی پیر مغاں!

خاک او گشتم وچندیں در جانم دادند

ے

قدلسعت حیة الهوی کبدی
فلاطبیب لها ولا راقی
الا الحبیب الذی شغفت به
فعنده رقیتی وتریاقی

وانی واللّٰه قد رضیت باللّٰه ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا وبشیخی امداد الله للعالمین مرشدا ووليا وبكم يا مولانا هاديا مهديا فهذا الذى ذكر كان من خبری وحقیقة امری فباللّٰه هو عین الصدق ومحض الحق ما كان فيه من كذب ولا شعر ولا خداع ولا سحر فيا سيدی للّٰه ان تقبلوا عذری بخلقكم العظيم ولا تصغوا الى كل هماز لماز مشاء بنميم ولا تخرجونی من الجماعة فانی ارجوا ان اكون معكم يوم تاتی الساعة لكن لا تطيق همتی ان اناهذبا لمخالفته مع الاعلان عسى ان یکون من اللّٰه تعالى مكان فاينداوه یوجب الهوان والخسران فانی احسبه من فرقة اهل الملامة ولكن ليس بمنصب الامامة نعم التزمت على نفسی انکار طریق یخالف السنة والكتاب على راس المنبر والمحراب وان من مصلحتی ان یکتم هذا السر لئلا یلحقنی الضر والشر وهو المامول

من جنابکم ومن قاری کتابکم ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذلك امرا ویکون ھذا السر جھرا وھا انا قد اشتد الانتظار منی ان تبشرونی برضاکم عنی رضی اللّٰہ عنا وعنکم وعن جمیع المسلمین، بحق سیدنا محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم ابدالابدین

۲۹/ ذوالقعدۃ ۱۳۱۴ھ

(یکم مئی ۱۸۹۷ء)

ترجمہ: ’’اللہ کے لیے ہے سب تعریف اور سلام اس کے افضل واعلیٰ پیغمبر پر۔ اس کے بعد از بندۂ ذلیل بہ خدمت مخدوم ومطاع جلیل! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

اور مشتاق دل کے اظہار شوق کے بعد عرض ہے کہ دریں ایام مولوی منور علی صاحب سے ملنے کا بندے کو اتفاق ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت مولانا تم سے ناراض ہیں، کیوں کہ تم نے اپنے بعض اقارب کا وہ طرز عمل اختیار کرلیا ہے جو حضرت کے طریق عمل کے خلاف ہے۔ پس ضرور ہے کہ آپ معذرت کریں اور مولانا کو راضی کریں۔ یہ خبر سن کر مجھے نہایت صدمہ اور بہت رنج ہوا۔ اپنے آپ کو میں نے ملامت کی اور سچ کے سوائے کسی شئے کو نجات دینے والا نہ سمجھا۔ پس اے ہمارے آقا! میں اس وقت حیرت اور طلب کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا اور اس بات کا متجسس تھا کہ کوئی مجھ کو اس رنج وفکر سے چھڑا لے۔ ناگاہ میرے قصد اور ارادے کے بغیر قریب سے ایک منادی نے مجھے پکارا کہ ’لا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے، تجھے اس گہرے سمندر سے نجات دوں گا‘۔

اور ظاہر ہے کہ ڈوبتا ہوا شخص تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے، کیوں کہ وہ

پریشانی وتشویش میں مبتلا ہے، اور میرا تو یہ حال تھا کہ اپنے پیارے فریادرس طبیب (اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ) سے کئی دریا پار پڑا تھا (پس اس ندا کی طرف جھک گیا)، مگر باوجود اس کے میں نے بزرگوں کی اس نصیحت کو ایک دن بھی نہ چھوڑا کہ 'صفا صفا لے لو گدلا گدلا چھوڑ دو'۔ پھر جب میری سعی نے ندا کنندہ کی خاک بوسی نعلین تک مجھ کو پہنچا دیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے بیعت کی تجدید کرلی، اس امید پر کہ شاید مافات کی مکافات ہو جائے۔ جب واپس ہوا ہوں تو پیاس بڑھی ہوئی پائی اور قریب تھا کہ (دھوکہ کھاؤں) سپید ریت کو رکا ہوا پانی سمجھ جاؤں، اور میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ سوائے حیرت وتوحش کی زیادتی اور تنگ دلی ودہشت کی ترقی کے کچھ نہ پایا، تب میں نے اپنے محبوب کو سارا حال لکھ بھیجا۔ دل سے یوں عرض کیا: میرے مرشد، میرے مولیٰ، میری وحشت کے انیس، میری دنیا کے میرے دین کے جائے پناہ! میرے فریادرسا مجھ پر ترس کھاؤ کہ میں آپ کی حب کے سوا رکھتا نہیں توشۂ راہ۔ خلق فائز ہو آپ سے اور میں حیران۔ رحم کی ہادی سن اب تو ادھر کو بھی نگاہ میرے سردار! خدا واسطے کچھ تو دیجیے۔ آپ معطی ہیں مرے میں ہوں سوالی اللہ!

پس اعلیٰ حضرت نے میری معذرت قبول فرمائی اور مدد کی اور محبت وبزرگی کے ساتھ لیا اور سلامتی کے کنارے پر لا کھڑا کیا، جس کے سبب بہ شوق میں نے اس طرح نغمہ سرائی کی اور بہ ذوق یہ ابیات پڑھے:

دوش وقت سحر از غصہ بہ خاتم دادند
واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

کیمائی ست عجب بندگی پیر مغاں
خاک او گشتم وچندیں در جا تم دادند

ڈس لیا عشق کی ناگن نے کلیجہ میرا
کون منتر پڑھے اور کس سے رکھوں جان کی آس
ہاں وہ جاناں کہ مری جان ہے جس پر قرباں
جھاڑنا جانتا ہے رکھتا ہے تریاق کو پاس

اور میں بہ خدا راضی ہوا۔ اللہ کو رب سمجھنے سے اور اسلام کو دین بنانے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے اور اپنے شیخ حضرت امداد اللہؒ کو عالم کا مرشد اور ولی اور آپ کو اے ہمارے آقا: رہبر اور ہدایت یاب سمجھنے سے، سو جو کچھ عرض ہوا یہ ہے میرا قصہ اور حقیقت الامر جو بہ خدا عین صدق اور محض حق ہے، جس میں نہ جھوٹ ہے نہ افترا، اور نہ دھوکہ ہے نہ مزاح۔ پس اے میرے سردار! اللہ واسطے میرا اعذر اپنے اخلاق سے قبول فرما اور کان بھی نہ لگایئے کسی بدگو عیب چیں چغل خور کی طرف۔ مجھے اپنی جماعت سے ہرگز خارج نہ سمجھیے، میں تو واقعی امید رکھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ محشور رہوں گا قیامت کے دن، ولیکن میری ہمت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی کہ کھلم کھلا (ندا کنندہ) کی مخالفت کرنے لگوں۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارتبہ ہو؟ پس اس کو ایذا پہنچانی موجب ذلت وخسارہ بن جائے۔ اس میں شک نہیں کہ میں اس کو مستحق ملامت گروہ میں سمجھتا ہوں ولیکن امامت کا منصب نہیں (کہ روک سکوں)، ہاں اپنے نفس پر میں نے لازم سمجھ لیا ہے کہ جو طریق سنت وکتاب اللہ کے مخالف ہو اس کا انکار بالائے ممبر اور اندرون محراب کرتا رہوں، اور میری

مصلحت اس کی مقتضی ہے کہ یہ راز مخفی رہے، تا کہ مجھے کوئی ضرر یا شر نہ پہنچے، اور اسی کی آپ کی جناب سے اور نیز خطوط کے پڑھنے والے سے امید بھی ہے۔ کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا فرما دیں اور یہ راز آشکارا ہو جائے۔ مجھے سر تا پا انتظار تصور فرمائیں اس کا کہ آں حضرت کے مجھ سے راضی ہو جانے کا مژدہ مجھ تک پہنچے۔ حق تعالیٰ سدا راضی رہیں ہم سے اور آپ سے اور تمام مسلمانوں سے طفیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے''۔

جواب اول از حضرت گنگوہیؒ،

طریق بزرگان سے روگردانی کرنے والا خلف رشید نہیں ہے:

اما بعد حمد الله على نواله والصلوة على رسوله محمد واٰله وقد وصلت صحيفتكم الى وقرات رقيمتكم على حتى تبينت معذرتكم لدى فحبا لكم ان اجبتم طريق السنة ولا شقاق بيننا بعد ذاك ولاظنه غير انى اسمع منكم ترتكبون امورا هى عندى بدعة ولعلكم لم تظنوها داخلة فى تلك الشرعة لكن هذا من مثلكم بعيد وليس المعرض عن سبل الاسلاف برشيد واما بادرة البيعة ثم التدارك عنها بالرجعة فما احمد هذا العود واحسن لو لا انكم تبتم سرا واتيتم الذنب بالعلن مع ان التوبة على حسب الحوبة كيف وانتم ممن يقتدى به فى ديارة حتى ان بيعتكم هذه زادته بهجة فى امصاره وقد قال النبى صلى الله عليه وسلم من سن

سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها الی یوم القیٰمة ومن سن سنة سیئة فعلیه ووزرها وزر من عمل بها الی یوم القیامة وقال من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الدینؔ فاخاف ان یول الیکم وزر هذا التضلیل هذا وانتم اعلم بکم واللّٰه علی ما نقول وکیل

۵/ ذوالحجة ۱۳۱۴ھ

(۷/مئی ۱۸۹۷ء)

ترجمہ: ’’اللہ کی عطاؤں پر اس کی حمد، اور اس کے رسول اور آلِ رسول پر صلوٰۃ کے بعد مطالعہ فرمائیں۔ آپ کا خط پہنچا، مضمون پڑھا، آپ کی معذرت ظاہر ہوئی۔ مجھے آپ سے محبت ہوئی کہ آپ نے طریق سنت کو محبوب سمجھا۔ اب تو مجھ میں آپ میں کوئی امر خلاف اور بدگمانی کا رہا ہی نہیں بہ جز اس کے کہ میں سنتا ہوں آپ چند امور ایسے اختیار کیے ہوئے ہیں کہ جو میرے نزدیک درست نہیں اور شاید آپ بھی ان کو شریعت میں داخل تو نہ سمجھتے ہوں گے، تاہم آپ جیسے شخص سے اتنا بھی بعید ہے۔ اپنے بزرگوں کے طریق سے روگردانی کرنے والا صاحب رشد وخلف رشید نہیں ہے۔ اب رہا (اس شخص سے) بیعت میں جلدی کرنا اور پھر اس سے رجوع کے ساتھ اس کی تلافی، سو اس کو میں پسند نہیں کرتا کہ گناہ تو اعلانیہ ہوا اور توبہ خفیہ؟ یہ ظاہر ہے کہ توبہ حسب گناہ ہونی چاہیے۔ بھلا یہ پوشیدہ توبہ کیوں کر کافی ہوسکتی ہے؟ حال آں کہ اس شخص کے اطراف بلاد میں لوگ آپ کا اقتدا کرتے ہیں، حتیٰ کہ آپ کی بیعت نے ان اطراف میں اس شخص کی رونق بڑھادی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں:
'جس نے کسی طریق مستحسن کی بنا ڈالی تو اس کو اس کا بھی اجر ملے گا، اور جو بھی اس طریق پر عمل کرے گا سب کا اجر اس کو حاصل ہوگا، اور جس نے کسی برے طریق کی ڈگر ڈالی تو اس پر اس کا بھی گناہ ہے اور ان سب کا وبال اس کی گردن پر ہے جو آیندہ اس پر عمل کریں گے'۔
نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
'جس شخص نے بدعتی کی توقیر کی اس نے دین کے منہدم کرنے میں اعانت کی'۔ پس مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ دوسروں کو گم راہ بنانے کا گناہ آپ پر نہ ہو۔ بہ غور سوچیے اور آیندہ آپ اپنے حال سے زیادہ واقف ہیں۔ وَاللهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلُ!

دوسرا مکتوب از حضرت تھانویؒ، خیالات کا اظہار:

بہ حضور لامع النور مخدوم ومطاع نیاز مندان دامت فیوضہم وبرکاتہم

بعد تسلیم خادمانہ عرض ہے: والا نامہ ۸/ ذو الحج (۱۳۱۴ھ/ ۱۰/ مئی ۱۸۹۷ء) کو شرف صدور لایا، معزز وممتاز فرمایا۔ قا[illegible]یں کو تسلی ہوئی۔ اب تک اس سوچ میں کہ کیا عرض کروں؟ جواب میں [illegible] ہوئی، مگر چوں کہ اظہار مرض میں شرم کرنے سے معالجہ بگڑتا ہے، اس لیے کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوا۔

جن دو امروں کی نسبت حضور نے ارشاد فرمایا وہ بہت صحیح اور بجا ہے۔ فی الواقع مجھ کو ان میں ابتلا ہوا، اب حضور کے الطاف واخلاق کے وثوق پر دونوں امر کی نسبت بے تکلف اپنے خیالات ظاہر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ اس میں غور فرما کر جو حکم میری حالت کے مناسب ہو صادر فرمایا جائے۔ خدا کی قسم! میں جو کچھ لکھتا ہوں محض استشارہ واسترشاداً لکھتا ہوں۔ نعوذ باللہ طالب علمانہ قیل وقال مقصود نہیں، اور میں سچے دل سے یکا وعدہ کرتا ہوں کہ بعد

حصول شفائے قلب جس طرح حکم ہوگا اس میں ہرگز حیلہ وعذر نہ ہوگا۔ امید ہے کہ میری بے تکلفی کو معاف فرمایا جائے، کیوں کہ بدوں (بلا) اظہار اپنے جمیع ما فی الضمیر کے جواب شافی نہیں ہوتا: ؎

چنداں کہ گفتیم غم باطبیباں
در ماں نہ کردند مسکین غریباں
ما حال دل را بایار گفتیم
نہ توان نہ ہفتن درد از طبیباں

امر اول شرکت بعض مجالس کی، الحمد للہ مجھ کو نہ غلو وافراط ہے نہ اس کو موجب قرب سمجھتا ہوں، مگر توسع کسی قدر ضرور ہے اور منشا اس توسع کا حضرت قبلہ وکعبہ کا قول وفعل ہے، مگر اس کو حجۃ شرعیہ نہیں سمجھتا، بلکہ بعد ارشاد اعلیٰ حضرت کے خود بھی میں نے جہاں تک غور کیا اپنے فہم ناقص کے موافق یوں سمجھ میں آیا کہ اصل عمل تو محل کلام نہیں ہے، البتہ تقییدات وتخصیصات بلاشبہ محدث ہیں۔ سو اس کی نسبت یوں خیال میں آیا کہ ان تخصیصات کو اگر قربت وعبادت مقصودہ سمجھا جائے تو بلاشک بدعت ہیں اور اگر محض امور عادیہ مبنی بر مصالح سمجھا جائے تو بدعت نہیں بلکہ مباح ہیں، گو مباح کبھی بہ وجہ واسطہ عبادت بن جائے کے لغیرہ عبادت سمجھ لیا جائے۔ چناں چہ بہت سے مباحات کی یہی شان ہے، اور میرے فہم ناقص میں تخصیصات طرق اذکار واشغال اسی قبیل سے معلوم ہوئی، جو کہ اہل حق میں بلانکیر جاری ہیں۔ کوئی معتد بہ فرق تامل سے بھی نہ معلوم ہوا۔ ہاں ان تخصیصات کو کوئی مقصود بالذات سمجھنے لگے تو ان کے بدعت ہونے میں بھی کلام نہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ایک اور خیال بھی آیا کہ گو اس صورت میں یہ بدعت اعتقادی

نہ ہوگا، مگر اس کا اہتمام والتزام بدعت عملی تو ہوگا، لیکن خصوصیات طرق ذکر اس میں بھی ہم پلہ معلوم ہوئے۔

تیسرا اور خیال ہوا کہ گو ایسے فہیم آدمی کے حق میں بدعت نہ ہوگا، مگر چوں کہ عوام کو اس سے شبہ اس کی ضرورت یا قربت کا ہوتا ہے، ان کے حفظ عقیدہ کے لیے یہ واجب الاجتناب ہوگا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ احتمال ان تخصیصات اذکار میں بھی نظر آیا کہ اکثر عوام اس طریق کی خصوصیات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں اور علماً وعملاً ان کا پورا التزام کرتے ہیں، مگر ان کا خیال خواص کے فعل میں موثر نہیں سمجھا جاتا۔

چوتھا خیال ایک اور پیدا ہوا کہ سب کچھ سہی مگر یہ خصوصیات بعض قواعد واصول فقہ حنفی کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، مگر یہی امر ان خصوصیات اعمال واشغال میں بھی معلوم ہوا، بلکہ ذکر جہر وغیرہ تو امام صاحبؒ کے قول کے صریح خلاف ہے، مگر باوجود ان سب قصوں کے جب خصوصیات طرق سلوک شایع وذایع ہیں تو اس سے یوں سمجھ میں آیا کہ تخصیص وہی بدعت ہوگی جو عقیدتاً ہو، اور التزام بھی وہی ممنوع ہوگا جس کے ترک پر شرعی حیثیت سے ملامت ہو، اور عوام کا شبہ خواص کے حق میں اس عمل کو بدعت نہ بنادے گا، اور بعض اصول حنفیہ کی مخالفت شرع کی مخالفت نہ سمجھی جائے گی۔

ان خیالات کے ذہن نشین ہونے سے ان خصوصیات کے انکار میں کمی پیدا ہوئی۔ اس کا مرتبہ فروع ومسائل اختلافیہ کا سا آنے لگا، مگر اس کے ساتھ ہی نہ کسی دن ان اعمال کی وقعت ذہن میں آئی نہ خود رغبت ہوئی نہ اوروں کو ترغیب دی، بلکہ اگر کبھی اس قسم کا تذکرہ آیا تو یہی کہا گیا کہ اولیٰ یہی ہے کہ خلافیات سے بالکل اجتناب کیا جائے، مگر جس جگہ میرا قیام ہے وہاں ان مجالس کی کثرت تھی،

اور بے شک ان لوگوں کو غلو بھی تھا، چناں چہ ابتدائی حالت میں اس انکار پر میرے ساتھ بھی لوگوں نے مخالفت کی، مگر میں نے اس کی کچھ پروانہ کی۔ تین چار ماہ گزرے تھے کہ حجاز کا اول سفر ہوا تو حضرت قبلہ نے خود ہی ارشاد فرمایا کہ اس قدر تشدد وانکار مناسب نہیں ہے۔ جہاں ہوتا ہو انکار نہ کرو، جہاں نہ ہوتا ہو ایجاد نہ کرو، اور اس کے بعد جب میں ہند کو واپس آیا تو طلب کرنے پر شریک ہونے لگا، اور عزم رکھا کہ ان لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی جائے۔ چناں چہ مختلف مواقع ومجالس میں ہمیشہ اس کے متعلق گفتگو کرتا رہا، اور جتنے امور اصل عمل سے زیاد تھے سب کا غیر ضروری ہونا اور ان کی ضرورت کے اعتقاد کا بدعت ہونا صاف صاف بیان کرتا رہا، حتیٰ کہ اس وقت میری رائے میں ان کا عقیدہ بعض کا عین توسط پر بعض کا قریب توسط کے آپہنچا، مگر بہ وجہ قدامت عادت کے عمل کے ارتفاع کی امید نہیں ہے۔ عدم شرکت میں اس اصلاح کی ہرگز توقع نہ تھی۔ ایک غرض تو شرکت سے میری یہ تھی۔

دوسرے میں نے وہاں دیکھا کہ وعظ میں لوگ کم آتے ہیں اور ان مجالس میں زیادہ اور ہر مذاق اور ہر جنس کے۔ چناں چہ ان مجالس میں مواقع ان کے پند ونصائح اور اصلاح عقاید واعمال کا بہ خوبی ملا اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی اپنے عقاید فاسدہ واعمال سیئہ سے تائب وصالح ہوگئے۔ بہت روافض سنی ہوگئے۔ بہت سے سود خوار وشرابی وبے نماز وغیرہم درست ہوگئے۔ غرض اکثر حصہ وعظ ہوتا تھا، دوسرا بیان برائے نام۔

تیسرے میں نے دیکھا کہ وہاں بدوں (بلا) شرکت ان مجالس کے کسی طرح قیام ممکن نہیں۔ ذرا انکار کرنے سے وہابی کہہ دیا، درپئے تذلیل وتوہین زبانی وجسمانی کے ہوگئے اور حیلہ وبہانہ ہر وقت ممکن نہیں۔ یہ تو ممکن ہے اور کرتا

بھی ہوں کہ فیصدی نوے موقع پر عذر کر دیا اور دس جگہ شرکت کر لی، اور شرکت بھی اس نظر سے کہ ان لوگوں کو ہدایت ہوگی، اور یوں خیال ہوتا ہے کہ اگر خود ایک مکروہ کے ارتکاب سے دوسرے مسلمانوں کے فرائض وواجبات کی حفاظت ہوتو اللہ تعالیٰ سے امید تسامح ہے۔ بہر حال وہاں بدوں (بلا) شرکت قیام کرنا قریب بہ محال دیکھا، اور منظور تھا وہاں رہنا، کیوں کہ دنیوی منفعت بھی ہے کہ مدرسے سے تنخواہ ملتی ہے، اور بفضلہٖ تعالیٰ وعظ وغیرہ کے بعد تو لینے کی مطلقاً عادت نہیں ہے، باوجود اصرار کے صاف انکار کر دیتا ہوں، مگر تنخواہ ضرور لیتا ہوں، اور دینی منفعت بھی میرے زعم میں تھی اور اب بھی ہے بلکہ روز افزوں ہے، کیوں کہ تعلیم وتدریس ووعظ وغیرہ کا سلسلہ جاری ہے۔ ان منافع کی تحصیل کی غرض سے منظور تھا کہ قیام کروں اور بدوں (بلا) شرکت قیام دشوار تھا۔ اس ضرورت سے بھی شرکت اختیار کی، لیکن ان سب اسباب وضرورت کے ساتھ بھی اگر کسی دلیل صحیح وصریح سے مجھ کو ثابت ہو جاتا کہ اس کی شرکت موجب ناراضی اللہ ورسول کی ہے تو لاکھ ضرورتیں بھی ہوتیں سب پر خاک ڈالتا۔ بفضلہٖ تعالیٰ بہت سے منافع مالیہ کو اسی وجہ سے خیر باد کہہ چکا ہوں۔ توسع رائے کے اسباب اوپر معروض ہو چکے ہیں۔ بہر حال میرے خیال میں یہ امور خلاف اولیٰ ضرور ہیں مگر بہ مصالح دینیہ ان کے فعل میں گنجایش نظر آتی ہے، اور عوام کی اصلاح بھی ساتھ ساتھ واجب سمجھتا ہوں اور اپنی وسعت کے موافق کرتا بھی رہتا ہوں۔

اور اس کے ساتھ ایک خیال اور بھی ہوا اور وہ بہت نازک بات ہے، وہ یہ کہ اگر یہ شرکت بالکل اللہ اور رسول کی رضا کے خلاف ہے تو حضرت قبلہ کے صریح ارشاد کی کیا تاویل کی جائے؟ بلکہ اہل علم کے اعتقاد وتعظیم وتعلق وارادت سے عوام کا ایہام ہے۔ اس سے ہنڈ پھر کر یہی اطمینان ہوتا ہے کہ شرعاً گنجایش ضرور

ہے۔ یہ خلاصہ میرے خیالات وحالات کا تھا۔ اب حضور جیسا ارشاد فرمائیں۔ اگر اس میں بالکل گنجایش نہیں ہے تو میں آج ہی تعلق ملازمت کو قطع کر دوں گا۔ رزاق حقیقی حق سبحانہ وتعالیٰ ہے، قیامت میں کوئی کام نہ آئے گا، مگر اس صورت میں حضرت قبلہ وکعبہ کے ساتھ شرعاً کیا تعلق رکھنا چاہیے؟ اور حضرت کے قول وفعل کو کیا سمجھنا چاہیے؟ اور اگر تھوڑی بہت گنجایش ہو خواہ عموماً یا خاص، میری حالت جزئی کی مصلحت سے تو اس گنجایش سے تجاوز نہ کیا جائے گا، اور اس کے کتمان کا حکم ہوگا تو ان شاء اللہ تعالیٰ عمر بھر اس کا انتساب حضور حضرت کی طرف میری زبان وقلم سے نہ نکلے گا۔ غرض جس طرح حضور کا ارشاد ہوگا ان شاء اللہ بہ سر وچشم منظور ہوگا، اور شاید کچھ شبہ پیدا ہو تو بے تکلف اس کے مکرر پیش کر دینے کی اجازت کا خواہاں ہوں۔

امر دوم: میرے تعلق سے عوام کا معتقد ہو جانا مجھ کو چند بار اس امر میں اندیشہ سخت ہوا، مگر جہاں تک میں نے سوچا شاید بہ مشکل دو تین آدمی ایسے نکلیں گے جن کو اس وجہ سے اعتقاد ہوا، ورنہ خود اپنی رائے سے بعض عوام معتقد ہوگئے۔ قبل میرے تعلق کے جن لوگوں کو مجھ سے حسن ظن تھا انہوں نے اس روایت ہی کی تکذیب کی، اور جن کو کچھ احتمال سا ہوا بھی سو وہ مجھ سے بدگمان ہوئے، ان سے نیک گمان نہیں ہوئے اور زیادہ وہی لوگ معتقد ہیں جن کو عمر بھر بھی مجھ سے کچھ تعلق عمومی یا خصوصی نہیں ہوا۔ اب جہاں تک غور کرتا ہوں بالتعیین عدم قابلیت کے اعلان میں بہت سے مفاسد نظر آتے ہیں۔ اولاً اب تک اکثر لوگ اس تعلق کی تکذیب کرتے ہیں، کیوں کہ ان لوگوں نے نہ اس کا مشاہدہ کیا نہ معتبر ناقل سے ان کو یہ خبر پہنچی۔ ایک آدھ غیر معتبر عامی اس کے ناقل ہیں، جن کی اکثر لوگ تکذیب کرتے ہیں، اور میں نے ہمیشہ اس کا کتمان کیا۔ اگر

اعلان رجوع کا کیا جائے تو مرجوع عنہ کا اقرار لازم آتا ہے۔

دوسرے چوں کہ اس اعلان میں صورتاً ان کی اعانت ہے، اس لیے اندیشہ ہے کہ اس میں زیادہ شور وشر پھیل جائے، جس کا اثر معلوم نہیں اجانب واقارب میں کہاں تک پہنچے۔ اس لیے یوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک خط تو بے تعلقی کی اطلاع کا ان کو لکھ دیا جائے، وہ خود اگر اس کا اظہار کردیں تو اس میں کوئی فتنہ نہ ہوگا، کیوں کہ اگر اظہار کیا جائے گا تو اس عنوان میں میری اہانت کی جائے گی، اور فتنے کا احتمال ان کی اہانت میں ہے، اور دوسرے لوگوں کے اطلاع کا یہ طریق ہو کہ تعیین بلا اعلان ہو جائے اور اعلان بلا تعیین خفیتاً اطلاع کردی جائے اور عام مجمع میں بہ طور قاعدۂ کلیہ کے شرائط اہلیت بیعت کے بیان کردیئے جائیں کہ جس شخص میں فلاں فلاں امور پائے جائیں وہ قابل بیعت ہے ورنہ نہیں۔ چناں چہ بندہ نے دونوں امر کا اہتمام کیا ہے، اور بھی زیادہ کرنے کا ارادہ ہے۔

چناں چہ جمعہ گذشتہ میں بندہ نے یہ مضمون بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور شرائط بیعت کو بتلا کر تمثیلاً حضور والا کا اسم گرامی بھی بتلا دیا کہ جس شیخ کی ایسی شان ہو اس کا غلام بننا چاہیے ورنہ اجتناب چاہیے۔

اس مضمون کو مکرر بھی بیان کرنے کا ارادہ ہے، اور خاص طور پر بالتعیین بعض سے کہا جاتا ہے، بعض سے کہنا باقی ہے، بلکہ یہ فکر ہے کہ جو لوگ اپنی رائے سے بھی معتقد ہو گئے ہیں ان کو بھی جہاں تک قدرت ہو سمجھایا جائے، چناں چہ بعض مواقع پر کامیابی ہوئی، بلکہ یوں خیال ہے کہ خود صاحب تعلق کو بھی بہ ذریعہ خط امور حقہ پہنچائے جائیں اور دعا بھی کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح یہ تعلق سراً ہوا ہے قطع تعلق بھی سراً ہو جائے، اور جس قدر اس میں جہر واعلان ہوا ہے قطع تعلق میں بھی جہر واعلان ہو جائے، بلکہ طریق

مذکور میں جہر واعلان کسی قدر زیادہ ہی ہے۔ اس صورت میں مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور فتنہ بھی نہ ہوگا، ورنہ بہت سے خلجانات معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر شرعاً یہ طریق کافی نہ ہو اور مشاق ومتاعب کا برداشت کرنا ضروری ہو تو بفضلہٖ تعالیٰ اللہ تعالیٰ ورسول کی تحصیل رضا میں مجھ کو یہ سب کچھ گوارا ہے۔ اگر اللہ ورسول ناراض رہے تو جان ومال آبرو کو کیا چولھے میں ڈالوں گا؟

احقر نے بلا تکلف اپنا مافی الضمیر پورا پورا حضور میں عرض کر دیا، اب حضور ان مضامین میں اور میرے مصالح دنیویہ واخرویہ میں خوب غور فرما کر ارشاد فرمائیں۔

میں ہندوستان میں بہ جز حضور والا کے کسی عالم یا درویش پر اطمینان کامل نہیں رکھتا، نہ کسی کو اپنا خیر خواہ سمجھتا ہوں نہ کسی سے اس قدر عقیدت ومحبت ہے۔ حضور کی سختی کو اوروں کے لطف پر ترجیح دیتا ہوں۔

گو ان امور کا عرض کرنا گستاخی سے خالی نہیں، مگر اللہ جانے ولولۂ قلبی اس عرض کا باعث ہے۔ آج کل بہ حصول رخصت وطن میں ہوں، بہ وجہ حجاب اور نیز بہ ایں خیال کہ مشافہتاً اس قدر انبساط ممکن نہ تھا، حاضری سے قاصر رہا۔ ۲۲ر تاریخ کو اپنے مدرسے چلے جانے کا ارادہ ہے۔ اگر ۱۹ر کو بھی جواب تحریر فرمایا جائے تو یہاں مل سکتا ہے ورنہ مدرسے میں۔

اب آخر عرض ہے کہ اگر کوئی مضمون خلاف مزاج والا معروض ہوا ہو تو معاف فرمایا جائے۔ دوسرے توقف جواب سے شاید حضور کو انتظار کی تکلیف ہوئی ہو، اس کو عفو فرمایا جائے۔ زیادہ حد ادب، والسلام خیر ختام۔ فقط!

۱۳ر ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ (۱۵ر مئی ۱۸۹۷ء)

جوابِ ثانی از حضرت گنگوہیؒ، آپ نے بدعت کو اب تک سمجھا ہی نہیں:

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفا عنہ

بہ عنایت فرمائے بندہ مولوی محمد اشرف علی صاحب دام مجدہم

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند:

آپ کا عنایت نامہ بہ جواب نیاز نامہ بندے کے پہنچا۔ اس وقت میرے پاس کوئی سنانے والا نہ تھا اور ہر کسی کو اس کا دکھانا مناسب نہ جانا۔ بعد مدت کے مولوی محمد صدیق گنگوہی گڑھی سے یہاں آئے، اس خط کے سرنامہ کو دیکھ کر انہوں نے اس کے دیکھنے کی خواہش کی، چوں کہ وہ بھی محرم راز تھے، ان سے بندے نے پڑھوا کر سنا، مگر موقع جواب کا اس وقت نہ ملا، بہ انتظار مولوی محمد یحیٰ صاحب کہ وہ اس وقت اپنے گھر گئے ہوئے تھے، اس خط کو اٹھا رکھا، جب وہ گنگوہ آئے تو آج دوسری محرم کو اس کا جواب لکھواتا ہوں (۱)۔

مکرما! امر اول کے باب میں آپ کو جو کچھ اشتباہ واقع ہوا ہے وہ دو امر ہیں:

امر اول اشغال طرق مشائخ علیہم الرضوان،

امر ثانی اشارہ جناب مرشد طال بقاؤہ۔

لہٰذا ہر دو امر کے باب میں بندہ کچھ لکھتا ہے، سو آپ بہ غور ملاحظہ کریں کہ اشغال مشائخ کی قیود تخصیصات جو کچھ ہیں وہ اصل سے بدعت ہی نہیں۔ اس کو مقیس علیہ ٹھہرانا سخت حیرانی کا موجب ہے۔ خاص کر تم جیسے فہمیدہ آدمی سے؟ کیوں کہ تحصیل نسبت اور توجہ الی اللہ مامور من اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر چہ یہ کلی مشکک ہے کہ ادنا اس کا فرض اور اعلیٰ اس کا مندوب اور صدہا آیات واحادیث سے

(۱) یہ جواب ۲ر محرم ۱۳۱۵ھ/ ۳ر جون ۱۸۹۷ء کو لکھوانا شروع کیا۔ خط کے آخر میں ۵ر محرم/ ۶ر جون کی تاریخ تحریر ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تین دن میں اس خط کی تحریر پوری ہوئی۔ (اعجاز)

مامور ہونا اس کا ثابت ہے، اور طرح طرح کے طرق واوضاع سے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ خاص حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ گویا ساری شریعت اجمالاً وہ وہی ہے کہ جس کا بسط بہ وجہ طول ناممکن ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر آیت و ہر حدیث سے وہی ثابت ہوتا ہے۔ پس جس چیز کا مامور بہ ہونا اس درجے کو ثابت ہے اس کی تحصیل کے واسطے جو طریقہ مشخص کیا جائے گا، وہ بھی مامور بہ ہوگا، اور ہر زمانے اور ہر وقت میں بعض موکّد ہو جائے گا اور بعض غیر موکّد۔ لہٰذا ایک زمانے میں یہ صوم وصلوٰۃ وقرآن واذکار مذکورۂ احادیث اس مامور بہ کی تحصیل کے واسطے کافی ووافی تھے۔ اس زمانے میں یہ اشغال بہ ایں قیود اگرچہ جایز تھے مگر ان کی حاجت نہ تھی۔ بعد چند طبقات کے جو رنگ نسبت کا دوسری طرح پر بدلا اور طبایع اس اہل طبقے کی بہ سبب بعد زمان خیریت نشان کے دوسرے ڈھنگ پر آگئیں تو یہ اوراد اس زمانے کے اگرچہ تحصیل مقصود کر سکتے تھے مگر بہ دقت ودشواری، لہٰذا طبیبان باطن نے کچھ اس میں قیود بڑھائیں اور کمی وزیادتی اذکار کی کی۔ گویا کہ حصول مقصد ان قیود پر موقوف ہو گیا تھا۔ لہٰذا ایجاد بدعت نہ ہوا، بلکہ اگر کوئی ضروری کہہ دے تو بجا ہے، کیوں کہ حصول مقصود بغیر اس کے دشوار ہوا اور وہ مقصود مامور بہ تھا، اس کا حاصل کرنا بہ مرتبہ خود ضروری تھا۔ پس گویا قیود مامور بہ ہوئیں نہ بدعت۔

بعد اس کے دوسرے طبقے میں اسی طرح دوسرا رنگ بدلا اور وہاں بھی دوبارہ تجدید کی حاجت ہوئی، ثم وثم۔ جیسا کہ طبیب موسم سرما میں ایک علاج کرتا ہے کہ وہ علاج موسم گرما میں مفید نہیں ہوتا، بلکہ حصول صحت کو بعض اوقات مضر ہو جاتا ہے، اور بہ اعتبار اختلاف زمانہ کے تدبیر علاج اول دوسرے وقت میں بدلی جاتی ہے، جو معالجات کہ سو برس پہلے ہمارے ملک کے تھے اور جو مطلب کہ کتب

سابقین میں لکھے ہوئے ہیں اب ہرگز وہ کافی نہیں، ان کا بدل ڈالنا کتب طب کے اصل قواعد کے موافق ہے، اگر چہ علاج جزوی کے مخالف ہو۔ پس اس کو فی الحقیقت ایجاد نہ کہا جائے گا بلکہ تعمیل اصل اصول کی قرار دی جائے گی۔

دوسری نظیر اعلائے کلمۃ اللہ ہے، جس کو جہاد کہتے ہیں۔ بہ تامل دیکھو کہ طبقۂ اولیٰ میں تیر اور نیزہ اور سیف (تلوار) بلکہ پتھر بھی کافی تھا۔ ملاحظہ احادیث سے۔ آپ کو معلوم ہے اور اس زمانے میں استعمال ان آلات کا سراسر مضر اور ایجاد توپ اور بندوق اور تار پیٹر کا واجب ہوگیا ہے، کیوں کہ تحصیل اعلائے کلمۃ اللہ بدوں (بغیر) اس کے محال اب ان ایجادات کو نہ کوئی بدعت کہہ سکے اور نہ تشبہ بہ کفار کہہ کر حرام بنا سکے، بلکہ اس کو فرض اور واجب اور مامور بہ کہنا ہوگا، کیوں کہ تحصیل مقصود اس پر موقوف سی ہوگئی ہے۔ پس یہ بھی مامور بہ ہوگیا۔ علی القیاس اشغال کا حال ہے۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ نے اشغال کو کیسے مقیس علیہ بنالیا؟ اس واسطے کہ مقیس علیہ ضروری اور مامور بہ اور مقیس نہایت سے نہایت مباح اور کسی وجہ سے موقوف علیہ کسی امر مندوب کا بھی نہیں، بلکہ بعض امور اس میں حرام اور مکروہ، پھر اس کو اس پر قیاس کرنا آپ جیسے آدمی سے کسی طرح موجب حیرانی نہ ہو، لہٰذا اس آپ کے قیام کو اس پر حمل کیا جائے کہ آپ نے بدعت کے مفہوم کو ہنوز سمجھا ہی نہیں۔ کاش ''ایضاح الحق الصریح'' آپ دیکھ لیتے یا ''براہین قاطعہ'' کو ملاحظہ فرماتے، یا یہ کہ تسویل نفس وشیطان ہوئی، اس پر آپ بدوں (بلا) غور عامل ہوگئے۔ اب امید کرتا ہوں کہ اگر آپ غور فرمائیں گے تو اپنی غلطی پر مطلع ومتنبہ ہوجائیں گے۔

اور امر ثانی کے باب میں اگر چہ سر دست آپ کو بہ وجہ فرط عقیدت ومحبت کے ناگوار گزرے اور اس بندے کو گستاخ وبے ادب تصور کرو، مگر حق کہہ دینے

سے مجھے یہ امر مانع نہیں، وہ یہ ہے کہ بندہ جو حضرت شیخ سے بیعت ہوا ہے اور جتنے اہل علم ذی فہم قدیم سے بیعت ہوتے رہتے تھے اور ہوتے رہے ہیں تو باوجود علم غیر عالم سے جو بیعت ہوئے تو اس خیال سے بیعت ہوئے اور ہوتے ہیں کہ جو کچھ استادوں سے دینی کتب میں انہوں نے پڑھا اور علم حاصل کیا کسی شیخ عارف سے اس علم کو علم الیقین بنالیں تاکہ عمل کرنا نفس کو اس علم پر سہل ہو جائے، اور معلوم مشہود بن جائے علی حسب استعداد، اس واسطے کوئی بیعت نہیں ہوا اور ہوتا کہ جو کچھ ہم نے پڑھا ہے اس کے صحت وسقم کو کسی شیخ غیر عالم سے پڑتال لیں اور احکام محققہ قرآن وحدیث کو اس کے قول سے مطابق کرلیں کہ جس کو وہ غلط فرمائیں اس کو آپ غلط مان لیں اور جس کو صحیح کہیں اس کو صحیح رکھیں، کہ یہ خیال سراسر باطل ہے۔ پس اگر کسی کا شیخ کوئی امر خلاف امر شرع کے فرمائے گا تو اس کا تسلیم کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ خود شیخ کو ہدایت کرنا مرید پر واجب ہوگا، کیوں کہ ہر دو کا حق ہر دو پر ہے، اور شیوخ معصوم نہیں ہوتے، اور جب تک شیخ کسی مسئلے کو جو بہ ظاہر خلاف شرع ہو بہ دلائل شرعیہ قطعیہ ذہن نشین نہ کردے مرید کو اس کا قبول کرنا ہرگز روا نہیں۔ اس کی نظیریں احادیث سے بہ کثرت ملتی ہیں۔ ایک نظیر بیان کرتا ہوں اس پر غور کیجیے۔

جب واقعہ مسیلمہ میں قراء بہت سے شہید ہوگئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ذہاب کثیر من القرآن کا ہوا، انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعد مباحثۂ بسیار قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قبول فرمایا اور اس کا استحسان ان کے ذہن نشین ہوگیا اور دونوں کی رائے متفق ہوگئی، اور سنیت بلکہ وجوب مقرر ہوگیا اور پھر زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس امر کے واسطے فرمایا تو باوجود اس بات کے کہ شیخین رضی

اللہ عنہما زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے علم و فضل میں بہت زیادہ تھے اور صحبت ان کی بہ نسبت زیدؓ کے طویل تھی اور ان کے باب میں حکم عام شارع علیہ السلام سے ہو چکا تھا کہ

اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر وعمر (رواہ البخاری)

''اقتدا کیجیو ان کا جو میرے بعد (جانشین) ہوں گے یعنی ابوبکرؓ اور عمرؓ کا''۔

مع ہذا زیدؓ نے چوں کہ اس امر کو محدث سمجھا تو یہی فرمایا:

کیف تفعلون شیئا لم یفعلہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟

''کیوں کر کرو گے ایسا کام جو کو نہیں کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے؟''

اور ان کے کہنے کو ہرگز تسلیم نہ کیا، کیوں کہ ایجاد بدعت ان کے نزدیک سخت معیوب تھا اور شیخین کو معصوم نہ جانتے تھے، لہٰذا مناظرہ شروع کر دیا، مگر جس وقت حضرات شیخینؓ نے ان کو سمجھا دیا اور سنیت اس فعل کی زیدؓ کو ثابت ہوگئی تو اس وقت بہ دل و جان قبول کر کے اس کی تعمیل میں مصروف ہوگئے۔ بخاری کو تم نے خود پڑھا پڑھایا اور دیکھا ہے، زیادہ کیا لکھوں؟ پس ایسا بہ دست شیخ ہو جانا کہ مامور و منہی کی کچھ تمیز نہ رہے، یہ اہل علم کا کام نہیں۔ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق یہ امر بھی عام ہے، اس سے کوئی مخصوص نہیں اور اگر کسی عالم نے اس کے خلاف کیا ہے تو بہ سبب فرط محبت کے اور جنون عشقیہ کے کیا ہے، سو وہ قابل اعتبار کے نہیں، اور ہم لوگ اپنے آپ کو اس درجے کا نہیں سمجھتے: ع

بمی سجادہ رنگیں کن اگر پیر مغاں گوید

انہی لوگوں کی شان میں ہے۔

اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ کہ مجلس سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے مجتنب رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''فعل مشائخ سنت نہ باشد''۔ آپ نے سنا ہوگا؟ اور حضرت سلطان المشائخؒ کا اس پر یہ فرمانا کہ نصیر الدین درست کہتا ہے۔ تصدیق تحریر بندے کی کرتا ہے۔ ... امر بہت باریک ہے جو آپ نے لکھا ہے، اس کے جواب میں اسی قدر کافی ... ۔ اسی واسطے مشائخ اپنے مریدین علما سے مسائل دین کی تحقیق کرتے رہتے تھے اور کرتے رہتے ہیں اور اپنی معلومات مخالفہ سے تائب ہوجاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے غذائے روح میں قصہ اس عارف کا جو غار میں رہتا تھا اور ٹکیہ موم کی آنکھ میں اور بتی نجاست کی ناک میں رکھتا تھا، لکھا ہے کہ انہوں نے مرید کے اس کہنے سے کہ اس صورت میں نماز نہیں ہوتی، اپنی نمازوں کا اعادہ کیا اور اس مسئلے کو قبول کیا۔

اور خود بندے کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرات حاجی صاحبؒ وحافظ صاحبؒ جو پہلے سے مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کر کے ان پر عامل تھے، بندے کے کہنے سے کتنے مسائل کے تارک ہوگئے، اور واللہ کہ حافظ صاحبؒ نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ ''ہم کو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکہ رہا''۔ پس چوں کہ بندہ ابتدائے صحبت سے خوکردہ ایسی عادات کا ہے اور فرط محبت وعقیدت سے عاری حضرت کے ارشاد کو جو بہ سبب تصدیق کرنے قول بعض مریدین بدفہم یا کم فہم کے اور مریدین خودغرض بدنام کنندہ پیران کے بہ حسن ظن خود صحیح سمجھ گئے ہیں، سردست قبول نہیں کرتا، بلکہ حضرت کو معذور جان کر خطا سے بری سمجھتا ہوں۔ قال علیہ السلام:

من افتی بغیر علم فاثمہ علی من افتاہ

''جس نے فتویٰ دیا بلا علم کے پس اس کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے فتویٰ دیا تھا(۱)''۔

لہٰذا حضرت کو معذور و بری جان کر ان خود غرضوں کو آثم اور ضال و مضل ومکتسب امتعہ دنیویہ در پردہ یقین کرتا ہوں، اور واللہ باللہ کہ تم پر خاصتاً ہرگز مجھے یہ گمان نہیں ہے، بلکہ تم کو جو کچھ پیش آیا ہے بہ فرط عقیدت واقع ہوا ہے۔ میں تم کو بھی اس امر میں معذور سمجھتا ہوں اور تمہارے واسطے دعائے خیر کرتا ہوں، اگر چہ میں تمہارا شاکی بھی ہوں، مگر یہ شکوہ میرا بہ وجہ محبت کے ہے، کیوں کہ شکوہ اپنوں کا ہی ہوتا ہے، غیروں سے کسی کو شکوہ نہیں ہوتا۔ امر اول کا جواب تمام ہو چکا۔

امر ثانی کے باب میں جو کچھ آپ نے تدبیریں لکھی ہیں اس میں بندہ کچھ دخل نہیں دیتا۔ جس طرح مناسب جانو اور مصلحت سمجھو اس کی تدبیر کرو۔ غرض خلق خدا کو مبتدع کے پنجے سے چھڑانا منظور ہے، جس طرح حاصل ہو، اور جو تشدد کہ موجب فساد ہو اس سے بچنا مناسب ہے۔

اس مرتبے کے مواعظ و بیانات آپ کے جو تھانہ بھون ہوئے ان کو سن کر بندہ بہت خوش ہوا، اور تمہارے واسطے دعائے خیر کرتا ہوں۔ فقط

اس تحریر میں اگر کوئی آپ کو شبہ ہو تو اس کے اظہار کی اجازت ہے، ہرگز شرم نہ کریں، بندہ ہرگز ناخوش نہ ہوگا۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہوگی تو بہ شرط فہم اس کے قبول کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

۵ رمحرم الحرام ۱۳۱۵ھ/ ۶ رجون ۱۸۹۷ء

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہ ایں وجہ معذور اور خطا سے بری تھے کہ کسی دوسرے مفتی کے فتوے پر عمل فرماتے تھے۔ پس اس کا گناہ تو مفتی مولوی پر ہوا نہ کہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر (عاشق)

تیسرا خط از تھانویؒ، اب تک بات پوری طرح سمجھ نہ سکا:

از کمترین خدام محمد اشرف علی

بہ عالی خدمت سراپا برکت دستگیر در ماندگان رہنمائے راہ گم گشتگان حضرت مولانا الحاج الحافظ المولوی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم!

بعد تسلیم نیاز خادمانہ التماس ہے کہ والا نامہ عین انتظار میں شرف صدور لایا۔ حضور نے جو اس نادان ناکارہ کی دستگیری فرمائی اگر ہر بن مو سے اس کا شکر ادا کروں تو محال ہے، پس بہ جز اس کے کیا عرض کروں: ع

شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

بالخصوص کلمات محبت وشفقت آمیز سے جو کچھ مسرت وطمانیت ہوئی شاید عمر بھر بھی کبھی مجھ کو میسر نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ حضور کی ذات اقدس کو بہ ایں افادہ ہم نیاز مندوں کے سر پر سلامت رکھے۔ چوں کہ حضور کے دربار سے مکرر استفسار کی اجازت عطا ہوئی ہے، اس لیے بہت ادب سے پھر اپنے بعض خیالات بہ غرض استشفا عرض کرتا ہوں۔

امر اول میں ارشاد عالی اچھی طرح سمجھ میں آگیا، مگر ابھی اس قدر شبہ باقی ہے کہ مقیس کو اگر ذریعۂ حصول ایک امر مامور بہ کا کہا جائے تو ممکن ہے، یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف کرنا اور آپ کی محبت وعظمت کا دل میں جگہ دینا ضرور مامور بہ ہے۔ زمان سابق میں بہ وجہ شدت ولہ وولع خود جا بجا چرچا بھی رہتا تھا اور عظمت ومحبت سے قلوب بھی لب ریز تھے، بعد چندے لوگوں کو ذہول ہوا۔ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے اخلاق وشمائل ومعجزات وفضائل جداگانہ مدون کیے، تاکہ اس کے مطالعے سے وہ غرض حاصل ہو، پھر یہی مضامین بہ ہیئت اجتماعیہ منابر (منبر کی جمع) پر بیان کیے جانے لگے، پھر اہل ذوق

نے اور کچھ قیود تخصیصات جن میں بعض سے سہولت عمل مقصود تھے، بعض سے ترغیب سامعین، بعض سے اظہار فرح وسرور، بعض سے توقیر وتعظیم اس ذکر وصاحب ذکر کی منظور تھی، بڑھالی مگر مطمح نظر وہی حصول حب وتعظیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہا، گو کہ حصول حب وعظمت کا توقف اس ہیئت خاصہ پر بہ معنی لــولاہ لامتنع عقلاً ثابت نہیں، مگر یہ توقف مقیس علیہ میں بھی نہیں، وہاں بھی توقف بہ معنی ترتب ہے یا لــولاہ لامتــنع عادتاً۔ سو اس کی گنجایش مقیس میں بھی ہے، کیوں کہ ترتب تو ظاہر ہے اور عند التأمل امتناع عادی ہی ہے، گو اس قدر فرق بھی ہے کہ یہ امتناع مقیس علیہ میں بہ اعتبار اکثر طبائع کے ہے اور مقیس میں بہ اعتبار بعض طبایع کے۔ چناں چہ دیار وامصار شرقیہ میں بہ وجہ غلبۂ الحاد ودہریت یا کثرت جہل وغفلت یہ حال ہے کہ وعظ کے نام سے کوسوں بھاگتے ہیں، اوران محافل میں یا بہ وجاہت میزبان یا اور کسی وجہ سے آکر فضائل وشمائل نبویہ اور اس ضمن میں عقائد ومسائل شرعیہ سن لیتے ہیں، اس ذریعے سے میرے مشاہدے میں بہت سے لوگ راہ حق پر آگئے، ورنہ شاید ان کی عمر گزر جاتی کہ کبھی اسلام کے اصول وفروع ان کے کان میں بھی نہ پڑتے، اور اگر توقف سے قطع نظر کیا جائے تب بھی ترتب یقیناً ثابت ہے، سو جواز کے لیے یہ بھی کافی معلوم ہوتا ہے۔

چناں چہ حضور کا ارشاد ہے کہ اس زمانے میں یہ اشغال بہ ایں قیود اگر چہ جائز تھے مگر ان کی حاجت نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ذریعہ تحصیل مامور بہ کا ہو خواہ وہ محتاج الیہ ہو یا نہ ہو، جائز ہے۔ سو ذریعہ ہونا اس کا تو بہت ظاہر ہے۔ سامعین کے قلوب اس وقت آپ کے احترام وعظمت وشوق وعشق وادب وتوقیر سے مملو ومشحون ضرور نظر آتے ہیں، البتہ اس میں جو امور مکروہ وحرام مخلوط

ہوگئے ہیں وہ واجب الترک ہیں۔ چناں چہ احقر ہمیشہ سے اس میں ساعی ہے اور رہا۔ بعض اصلاحیں جوکئی ماہ وعظ میں تفصیلاً بیان کی گئی تھیں بعض لوگوں نے اختصار کے ساتھ اسے چھاپ کر شایع بھی کر دیا تھا۔ ملاحظے کے لیے مرسل ہیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ سب نے اس کو تسلیم کیا اور اکثروں نے عمل بھی کیا۔ سوایسے امور مکروہہ مقیس علیہ میں بھی بہت سے شامل ہوگئے ہیں، جن کی اصلاح واجب ہے، اوران شاء اللہ تعالیٰ اس کے متعلق بھی ایک رسالہ عن قریب لکھ کر حضور کے ملاحظے میں بہ نظر اصلاح پیش کروں گا۔

دعا کا امیدوار ہوں، کیوں کہ جہلا وصوفیا کے سبب زندقہ کی بہت ترقی ہورہی ہے، سو اب تک مقیس و مقیس علیہ میں اچھی طرح سے فرق سمجھ میں نہیں آیا۔ ''براہین'' میں بدعت کی تعریف دیکھ لی۔ وہ ماشاء اللہ بالکل مقبول وصحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تمام معروضات میں وہ پیش نظر رہا کرے گی۔

دوسرا امر جو متعلق اتباع شیوخ کے ارشاد ہوا ہے، الحمد للہ کہ میرا اعتقاد کبھی اس کے برخلاف نہیں ہوا۔ امر ناجایز شیخ کے فرمانے سے کبھی جایز نہیں ہوسکتا۔ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق پر ایمان وایقان ہے مگر اتنا ضرور میرے خیال میں ہے کہ اگر مختلف فیہ مسئلے میں شیخ کامل کسی شق کا حکم کریں اس کا اتباع اقل درجے جائز ہے، تین شرط سے:

اول یہ کہ اس مسئلے میں دلائل وقواعد شرعیہ سے اختلاف کی گنجایش ہو۔

دوسرے یہ کہ شیخ کو حاکم اصطلاحی نہ ہو، مگر نورانیت قلب وشرح صدور وسلامت فہم رکھتا ہو، جس سے یہ توقع ہو کہ اس میں ایک شق کے ترجیح دینے کی قابلیت ہے، بالخصوص جب کہ شیخ کے مسئلے کے متعلق دونوں حکم متعارض پیش کیے جائیں اور دلائل جانبین کے بھی ذکر کردیئے جائیں، اور پھر وہ ایک شق کو ترجیح

دیں۔

تیسرے یہ کہ مرید کو بھی خواہ دلیل سے یا تصرف شیخ سے شرح صدر ہو جائے، سواحقر کے نزدیک مسئلہ متکلم فیہا میں یہ سب امور موجود ہیں، یعنی بہ وجہ اس کے کہ ایک جم غفیر اس کے جواز کی طرف گئے ہیں، مختلف فیہ و مجتہد فیہ معلوم ہوتا ہے، اور حضرت شیخ مدظلہٗ کے فہم میں اس قدر قوت ضرور سمجھ رہا ہوں کہ قولین متعارضین کے پیش ہونے کے بعد ایک جانب کو ترجیح دے سکیں، اور مجوزین سے حضرت صاحب مدظلہٗ کو گو حسن ظن ہے، مگر میں تو خود مشاہدہ کر آیا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی حضرت شیخ کی نظر میں خدام والا کی برابر مقبول منظور ومبصر ومحقق نہیں۔ بارہا اس قسم کے تذکرے آئے۔ حضرت صاحب خدام والا کے نسبت ''نعمت عظمٰی وغنیمت کبریٰ اور ہندوستان میں عدیم النظیر'' وغیرہ وغیرہ الفاظ ارشاد فرماتے ہیں، اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''خدام والا کے جمیع احکام وفتاوے محض للّٰہیت پر مبنی ہیں''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کو خود اس مسئلے میں شرح صدر ہے اور اس کو بہ اصرار فرماتے ہیں اور دوسرے قول پر انکار بھی نہیں فرماتے ہیں، اور مخاطب کو حضرتؒ کے ارشاد سے اطمینان بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اتباع کو اب تک جائز سمجھا ہوا ہوں۔ یہ اظہار تھا مافی الضمیر کا۔

احقر نے بہت کوشش کی ہے کہ تمام عریضے میں کسی مضمون میں مناظرے کا رنگ نہ آنے پائے، محض استفادہ واستشارہ مقصود ہے۔ شاید بلاقصد کہیں ایسا ہو گیا ہو تو حضور کے مکارم اخلاق اور مراحم اشفاق سے امید ہے کہ

انما الاعمال بالنیات

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''۔

پر نظر فرما کر معاف فرمایا جائے۔

حضور نے جو محبت کے ساتھ شکوہ فرمایا ہے اس پر اسی قدر مسرور ہوں جیسے کہ بنی مسلمہ و بنی حارثہ آیت:

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَاۙ وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَاؕ

کے نزول پر۔ اللہ تعالیٰ حضور کی برکت سے ہم بے راہوں کو راہ پر لگا دے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے باب میں خصوصاً وعموماً سعی کی جائے گی، دعا سے مدد فرمائیے۔ مواعظ پر حضور نے اپنی خوش نودی کا مژدہ ارشاد فرمایا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ حضور کی رضا کو دلیل قبول و وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں۔ خدا کرے صدور خطا پر بھی حضور ہم خدام سے کبھی ناخوش نہ ہوں بلکہ تنبیہ فرمائیں۔

بہ خدمت جناب کاتب صاحب کہ غالباً مولوی محمد یحییٰ صاحب ہیں، سلام شوق قبول ہو۔ اگر کوئی اور صاحب ہوں تو اسم گرامی سے مطلع فرمائیں۔ میں خط سے نہیں پہچان سکا۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام مع الاکرام، از کانپور۔

٨ رمحرم الحرام (یوم الخمیس) ١٣١٥ھ

(٦ رجون ١٨٩٧)

جوابِ ثالث از حضرت گنگوہیؒ،

ہم نے اہل مولود میں سے آج تک کسی کو متبع سنت نہیں دیکھا:

از بندہ رشید احمد عفی عنہ،

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند:

آپ کا خط آیا، آپ نے جو شبہ مساوات مقیس ومقیس علیہ میں لکھا ہے موجب تعجب ہے، مگر بہ مقتضائے حبك الشی یعمی ویصم ایسے شبہات کا ورود عجیب نہیں، دیکھو کہ مقیس علیہ خود ذکر ہے کہ مطلق ذکر مامور بہ کا فرد ہے، اور

اس کے ملاحظات وہیئات یاذکر ہیں یا وہ امور ہیں کہ نص سے ان کی اصل ثابت ہے۔

پس وہ ملحق بالسنۃ ہیں، اور بہ ضرورت موقوف علیہ مقصود کے تخصیص اور تعیین ان کی کی گئی، اور عوام تو کیا خواص میں بھی صدہا معدود شخص عامل ہیں، لہٰذا عوام کے ضرور سمجھ جانے کا وہاں محل نہیں، اور مقیس میں جو قیود مجلس ہیں بعض موہم شرک ہیں اور بعض امور دراصل مباح، مگر بہ سبب اشاعت ہر خاص وعام کے ملوث بہ بدعت ہو کر ممنوع ہو گئے کہ عوام ان کو ضروری بلکہ واجب جانتے ہیں، اور مجالس مولود میں جس قدر عوام کو دخل ہے خواص کو نہیں، اور یہ قیود مذکورہ غیر مشروعہ موقوف علیہ محبت کے ہرگز نہیں، آپ خود معترف ہیں۔ پس اس کو مقیس علیہ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اور داعی عوام کو سماع ذکر کی طرف ہونا اس وقت تک جائز ہے کہ کوئی منع شرعی اس کے ساتھ لاحق نہ ہو، ورنہ رقص وسرود زیادہ تر دواعی ہیں اور روایات موضوعہ زیادہ تر موجب محبت گمان کی جاتی ہیں۔

پس کون ذی فہم بہ علت دعوت عوام ان کا مجوز ہو جائے گا، یہ جواب آپ کی تقریر کا ہے کہ سماع ذکر ولادت بہ ہیئت کذائیہ کو آپ موجب ازدیاد محبت تصور کر رہے اور بہ ذریعہ غیر مشروع کے تحصیل محبت کی اجازت دیتے ہیں، ورنہ فی الحقیقت جو امر خیر کہ بہ ذریعہ نامشروعہ حاصل ہو وہ خود ناجائز ہے، اور جو کچھ بندے کا مشاہدہ ہے وہ یہ ہے کہ مولود کے سننے والے اور مشغوف (منہمک) مجالس مولود صدہا ہوتے ہیں کہ ان میں ایک بھی سنت کا متبع اور محبّ نہیں ہوتا، اور عمر بھر مولود سننے سے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومحبت سنت ذرہ بھر بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی، بلکہ بے اعتنائی عبادت اور سنن سے بے حد ان کے جی میں آجاتی ہے، اور اگر تسلیم کیا جائے کہ آپ کی محفل میلاد خالی ہے جملہ

منکرات سے اور کوئی امر نامشروع اس میں نہیں ہے تو دیگر مجالس تمام عالم کی تو سراسر منکر ہیں، اور یہ فعل آپ کا ان کے لیے موید ہے، اور یہ فعل مندوب آپ کا جب مغوی (گم راہ کنندہ) خلق ہوا تو اس کے جواز کا کیسے حکم کیا جائے گا؟ اگر حق تعالیٰ نے نظر انصاف بخشی تو سب واضح ہے ورنہ تاویل وشبہات کو بہت کچھ گنجایش ہے۔ مذاہب باطلہ کی اہل حق نے بہت کچھ تردید کی، مگر قیامت تک بھی ان کے شبہات تمام نہ ہوں گے۔ فقط

امر ثانی میں سنیے کہ حضرت اعلیٰ کا ارشاد پانچ چھ سال پہلے یہی تھا کہ ''نفس ذکر جائز اور قیود بدعت''۔ چناں چہ اس قسم کی تحریرات اب بھی موجود ہیں، مگر بعد حضور مجوزین کے جو تحقیق ہوئی ہے خلاصہ اس کا ''ہفت مسئلہ'' میں آپ نے خود لکھا ہے کہ جناب حضرت مدظلہٗ مجوزین ومانعین ہر دو کی تصویب فرمار ہے ہیں، حال آں کہ ایک مسئلہ جزئیہ عملیہ جو مجتہدین میں مختلف فیہ ہے عند اللہ حق اس میں ایک ہی ہے اور دوسرا غلط، تو کشف سے اگر صاحب کشف حق ایک جانب کو لے تو دوسری جانب کو حق نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ کشفاً ایک ہی حق ہوتا ہے۔ پس دونوں کی تصویب اور ایک کے ترجیح کے کیا معنی؟ سوائے اس کے کہ دونوں جانب علما تصور فرما کر اس مسئلے کو مختلف فیہ خیال فرمایا اور اس کو مسئلۂ فرعیہ تصور فرمایا۔ حال آں کہ یہ مسئلہ اعتقادیہ ہے۔ اگر چہ بادی النظر میں مسئلہ فرعیہ خیال کیا جاتا ہے، اور مسئلہ اعتقادیہ میں حق ایک ہی ہوتا ہے، ظاہر میں بھی مثل باطن کے اسی واسطے اہل اہوا اگر چہ صدہا علما ہیں، ان کی کثرت پر نظر نہیں ہوتی اور مسئلہ مختلف فیہا نہیں کہا جاتا، اور حضرت اعلیٰ وجۂ ترجیح کو خود ہی تحریر فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنے قلم سے لکھا ہے کہ ان قیود کو بدعت ہی نہیں سمجھا، کیوں کہ فرماتے ہیں کہ ''بدعت وہ ہے کہ غیر دین کو دین میں داخل کیا جائے''، اور اس پر

حدیث:

من احدث فی امرنا ھذا الخ

کو دلیل لائے ہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ یہ ترجیح کشفی نہیں ہے۔

باقی یہ بات کہ ترجیح اعلیٰ حضرت کی صحیح نہیں، اس کو میں نہیں لکھتا۔ اگر چہ یہ اصل ان کی صحیح ہے مگر اندراج اس جزئیہ کا اصل میں صحیح نہیں ہے۔ آپ تأمل کریں گے تو واضح ہو جائے گا، اور اس مسئلے کو مختلف فیہا و مجتہد فیہا سمجھنا تم سے تعجب ہے، کیوں کہ وہ مسئلہ مختلف فیہا بہ ظاہر دونوں طرف صواب ہوتا ہے کہ مجتہد مطلق یا مقید یا علمائے راسخین ملحق بہم میں مختلف فیہ ہوا، اور عوام علما کا اختلاف مسئلے کو مجتہد فیہ نہیں بتاتا بلکہ اس میں ایک ہی جانب حق ہوتی ہے کہ جو موافق قانون شریعت کے ہو، اور دوسری رائے باطل ہوتی ہے۔ فقط

اور جو کچھ بندے نے لکھا ہے اگر میں بھی یہ کہنے لگوں کہ میں نے بھی کشفاً اس کو معلوم کر لیا ہے تو بجا ہے، مگر میرا منہ اس کلمے کے کہنے کا نہیں ہے، اور چوں کہ آپ کو بہ حسن عقیدت اس کے خلاف شرح صدر ہو گیا ہے تو امید ہے کہ کسی کا لکھنا یا کہنا آپ کو مفید نہ ہوگا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ہم نے اہل مولود میں سے آج تک کسی کو متبع سنت نہیں دیکھا۔ فقط والسلام

مورخہ ۱۲/محرم ۱۳۱۵ھ (۱۳/جون ۱۸۹۷ء)

چوتھا مکتوب از حضرت تھانویؒ، ممنوع سے مشابہت کی حد کیا ہے؟

از احقر خلق محمد اشرف علی عفی عنہ

بہ خدمت سراپا برکت حضرت مولانا مقتدانا سیدنا الحافظ الحاج المولوی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم!

پس از تسلیمات مقرون بآلاف التکریم واصناف التعظیم معروض آں کہ والا

نامہ موجب اعزاز وافتخار ہوا۔ اپنی کج فہمی پر حضور کے اشفاق کو کہ برابر تفہیم فرماتے ہیں، دیکھ کر نہایت شرماتا ہوں اور شرم سے دوبارہ عرض کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، مگر حضور کی اجازت پر اس سے پہلے عریضے میں اپنے شبہات کو پیش کیا تھا، لیکن اس والا نامے کا یہ مضمون (اور چوں کہ آپ کو بہ حسن عقیدت اس کے خلاف شرح صدر ہو گیا ہے تو امید ہے کہ کسی کی تحریر آپ کو کافی نہ ہوگی) کسی قدر موہوم تکدر خاطر خدام والا ہوا۔ اعوذ باللّٰہ من غضب اللّٰہ وغضب رسول اللّٰہ وغضب ورثہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم!

اور اسی وجہ سے کچھ عرض کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ کئی روز اسی شش و پنج میں گزر گئے، مگر آخر میں یہ رائے ہوئی انما شفاء العی السوال بے عرض کیے ہوئے کیسے دل صاف ہوگا؟ اور یہ خیال ہوا کہ اب تک اس شرم ہی شرم میں شبہات پیدا ہو گئے۔ اگر پہلے سے تھوڑی جرأت کی جاتی تو یہ نوبت کاہے کو آتی؟ اس وجہ سے پھر عرض کرنے کی ہمت ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ التماس ہے کہ اگر میرا عرض کرنا خدام والا کو ذرہ بھر بھی موجب تکدر ہو تو بے تکلف صراحتاً فرما دیا جائے، میں ان شاء اللہ بلا حجت اتباع کروں گا۔ کیوں کہ احقر اپنی نسبت حضور سے ایسی سمجھتا ہے جیسے مقلد کی نسبت مجتہد سے، اور اگر اجازت ہوگی تو عرض کر سکوں گا۔

احقر کہتا ہے کہ میرے قلب میں تو نہ اس عمل کی محبت ہے نہ اس کے ساتھ شغف، بلکہ میں خود اس کے ترک کو افضل واولیٰ سمجھتا ہوں۔ چناں چہ اسی قسم کے امور کی بنا پر جلسہ ہائے دستار بندی کا اہتمام ترک کر دیا گیا اور اس مضمون کو چھاپ کر شایع بھی کر دیا، مگر یہاں کے مجموعی حالات کے مقتضی ایسے ہیں کہ مخالفت کرنا سخت دشوار وموجب فتنہ ہے، اور اس موقع پر ہر قسم کے لوگ مواعظ

بھی سن لیتے ہیں۔ منکرات کی اصلاح بھی اس طرح سے سہل ہے، شریک ہو جاتا تھا، مگر جب ہی تک کہ اس کو جائز سمجھا جائے۔ اسی واسطے جو شبہات دل میں آئے معروض ہوئے اور ان سے مقصود محض حصول شفا ہے کہ جس سے مجھ کو بفضلہٖ تعالیٰ جلدی امید کامیابی کی ہے۔

اور متعصبین کو تو دل سے طلب حق مقصود نہیں ہوتی، اس لیے ان کو عمر بھر حق کا پتہ نہیں لگتا۔ میں تو ہر نماز کے بعد دل سے دعا مانگتا ہوں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۙ الخ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا الخ

اللهم ارنا الحق حقا الخ

تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کرتا ہوں کہ حق کیا ہے؟ میرے اختیار میں بہ جز طلب وتوجہ الی اللہ وسوال علمائے محققین اور کیا ہے؟ آیندہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے، اور توبہ توبہ! میں کیا میرا شرح کیا؟ اور حضور کے جن کمالات کا مجھے اعتقاد ہے ان کے روبہ رو کشف کیا چیز ہے جس کی تصدیق میں مجھ کو تردد ہو؟ آپ کے ارشاد دل کو بہ دل وجان تصدیق کرتا ہوں، مگر بہ مقتضائے حدیث:

انما شفاء العی السوال

اس وقت پھر کچھ عرض کرتا ہوں۔

امر ثانی میں تو مجھ کو اجمالاً یوں اطمینان وشفائے کامل ہوگئی کہ اعلیٰ حضرت مدظلہم کی معرفت جس قدر حضور کو ہے ہم لوگوں کو قیامت تک بھی نصیب نہ ہوگی۔ اس میں کلام طویل کرنا خدام والا کو پریشان کرنا ہے۔ اب صرف امر اول رہ گیا، سو مقیس ومقیس علیہ میں واقعی یہ فرق تو ہے کہ مقیس علیہ کے عامل خواص میں بھی کم ہیں۔ اگرچہ اس وقت مدعیوں نے عوام جہلا میں بھی یہ قصہ پھیلا دیا ہے اور

وہ بھی برے عقیدوں کے ساتھ، مگر پھر بھی مقیس کی برابر شیوع نہیں، اور یہ بات بھی ہے کہ عاملان مقیس میں متبعان سنت کم ہیں، اگر چہ اس کی وجہ سوئے تعلیم بیان کرنے والوں کی ہو، مگر خیر کچھ سہی قلت ضرور ہے، اور یہ امر بھی یقینی ہے کہ جو امر خیر بہ ذریعہ غیر مشروع حاصل ہو وہ امر خیر نہیں ہے، اور جب قیود کا غیر مشروع ہونا ثابت ہو جائے تو اس کا ثمرہ کچھ ہی ہو جائز الحصول نہ ہوگا، اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ مجالس منکرہ بہ کثرت ہوتی ہیں، اور منکر کی تائید اگر غیر منکر سے ہو تو وہ بھی سزا وار ترک ہے، جب کہ عندالشرع فی نفسہ ضروری نہ ہو۔

اب اس وقت دو امر قابل عرض ہیں کہ تنقید مطلق کی آیا مطلقاً ممنوع ہے یا جب کہ اس قید کو مرتبہ مطلق میں سمجھا جائے، یعنی اگر مطلق واجب تھا تو قید کو بھی واجب سمجھا جائے اور اگر وہ مندوب و موجب قرب تھا تو قید کو بھی مندوب اور موجب قرب سمجھا جائے۔ درصورت اولیٰ تقییدات عادیہ میں شبہ ہوگا، اور صورت ثانیہ میں جب مطلق کو عبادت سمجھا اور قید کو بناء علی مصلحتہ ما عادت سمجھا جائے تو فی نفسہ اس میں قبح نہ ہوگا۔ ہاں اگر مودی بہ فساد عقیدہ عوام ہو تو اس میں قبح لغیرہ ہوگا، لیکن اگر اس کا فاعل زبان سے اصلاح عقیدہ عوام کی بالاعلان کرتا رہے اس وقت بھی یہ قبح رہے گا یا نہیں؟ اگر نہ رہے گا فبہا، اور اگر رہے گا تو اس صورت میں بعض اعمال میں جو عوام میں شایع ہو رہے ہیں اور ظاہراً ان کی عقیدت میں ان کی نسبت غلو و افراط بھی ہے، اور خواص کے فعل بلکہ حکم سے اور قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور اس کا وجوب شرعی بھی کسی دلیل سے ثابت نہیں ہوا، اور عوام بلکہ بعض خواص میں اس پر مفاسد بھی مرتب ہو رہے ہیں، ایسے اعمال میں شبہ واقع ہوگا۔

مثلاً تقلید شخصی کہ عوام میں شایع ہو رہی ہے اور وہ اس کو علماً و عملاً اس قدر

ضروری سمجھتے ہیں کہ تارک تقلید سے گو اس کے تمام عقائد موافق کتاب وسنت کے ہوں، اس قدر بغض ونفرت رکھتے ہیں کہ تارکین صلوٰۃ، فساق وفجار سے بھی نہیں رکھتے، اور خواص کا عمل وفتوائے وجوب اس کا موید ہے، گو خود ان کو علی سبیل الفرض اتنا غلو نہ ہو، اور دلیل ثبوت اس کی یہ مشہور ہے کہ ترک تقلید سے مخاصمت ومنازعت ہوتی ہے جو کہ ممنوع ہے۔ سو مودی الی الممنوع ممنوع ہوگا، پس اس کی ضد واجب ہوگی، مگر دیکھا جاتا ہے کہ بہ وجہ اختلاف آرا علما وکثرت روایات مذہب واحد معین کے مقلدین میں بھی عوام کیا خواص میں مخاصمت ومنازعت واقع ہے اور غیر مقلدین میں بھی اتفاق واتحاد پایا جاتا ہے۔

غرض اتفاق واختلاف دونوں جگہ ہے اور مفاسد کا ترتب یہ کہ اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے ان کے قلب میں انشراح وانبساط نہیں رہتا، بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے، پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے، خواہ کتنی ہی بعید ہو، اور خواہ دوسری دلیل قوی اس کے معارض ہو، بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلے میں بہ جز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو، بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو، مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح صریح پر عمل کرلیں۔ بعض سنن مختلف فیہا مثلاً آمین بالجہر وغیرہ پر حرب وضرب کی نوبت آجاتی ہے، اور قرون ثلاثہ میں اس کا شیوع بھی ہوا تھا، بلکہ کیف ما اتفق جس سے چاہا مسئلہ دریافت کرلیا۔ اگر چہ اس امر پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کو چھوڑ کر مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں، یعنی جو مسئلہ چاروں مذہبوں کے خلاف ہو اس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر ومنحصر ان چار میں ہے، مگر اس پر بھی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ اہل ظاہر ہر زمانے میں رہے، اور

یہ بھی نہیں کہ سب اہل ہوا ہی ہوں، وہ اس اتفاق سے علاحدہ رہے۔ دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہو جائے مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا۔ البتہ ایک واقعے میں تلفیق کرنے کو منع لکھا ہے، تاکہ اجماع مرکب کے خلاف نہ ہو جائے، باوجود ان سب امور کے تقلید شخصی کا استحسان و وجوب مشہور و معمول ہے، سو اس کا قبح کس طرح مرفوع ہوگا؟ دوسرا امر یہ کہ مسئلہ متکلم فیہا کے اعتقادی ہونے کی کیا صورت ہے؟ بادی النظر میں تو فرعی عملی معلوم ہوتا ہے۔

تتمیم فائدہ کے لیے دو امر کی تحقیق اور منظور ہے کہ تشبہ منہی عنہ کی حد جامع و مانع کیا ہے؟ بعض طرق ریاضت کے مثل حبس دم وغیرہ کے اہل ہند کے اعمال سے ہیں۔ انگرکھا اہل ہند کے لباس سے ہے۔ رجعت قہقری کعبہ سے وداع کے وقت اس میں تخصیص بھی ہے اور نسواں اہل ہند اپنے معابد کے ساتھ کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ التزام مالایلزم اعتقاد وجوب سے ممنوع ہوتا ہے یا بلا ناغہ اس کے استمرار سے بھی؟ گو کسی قدر صلابت و اہتمام کے ساتھ ہو، التزام ممنوع ہو جاتا ہے؟ صحابی ملتزم قراءت:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱

سے ما حملك على لزوم هذه السورة دریافت فرما کر نہی نہ فرمانا دلیل تقریری جواز لزوم عمل کی معلوم ہوتی ہے۔ ان شبہات کے صاف ہونے کے بعد امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حضور کو تکلیف دینے کی نوبت نہ آئے گی۔ میں بہت ادب سے اس جرات کی معافی چاہتا ہوں، مگر کیا کروں خدا جانے سب جگہ سے نا امید ہو کر خدام والا سے رجوع کیا ہے۔ اگر حضور بھی نا امید کر دیں گے تو پھر کہاں جاؤں گا؟ پھر شیطان بہکائے گا کہ اجتہاد کر، پھر خرابی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بایں فیوض و برکات سلامت با کرامت رکھے۔ آمین!

تازہ خبر حسرت اثر یہ ہے کہ کل مکۂ معظمہ سے میرے ایک ملاقاتی کا خط ایک حاجی صاحب لائے ہیں، لکھا ہے کہ حافظ حاجی احمد حسین صاحب امین الحجاج ۱۳/ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ (۱۵/ مئی ۱۸۹۷ء) کو رحلت فرمائے عالم بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، اللھم ارحمہم رحمۃ واسعۃ!

رنج ہے کئی طرح سے، اول خود ان کے انتقال کا رنج، دوسرے ان سے حجاج کو کس قدر نفع تھا؟ تیسرے حضرت صاحب کی تنہائی وتشویش کا، چوتھے چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال، پانچ ویں خدا کرے رد ودائع میں کوئی قصہ نہ ہو، اور اعلیٰ حضرت بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے ہیں۔ مد اللہ تعالیٰ ظلال فیوضہم!

زیادہ حد ادب۔ بہ خدمت مولوی محمد یحییٰ صاحب کاتب خطوط ومولوی صادق الیقین صاحب اگر حاضر ہوگئے ہوں سلام مسنون۔ از کان پور۔

۱۸/ محرم ۱۳۱۵ھ (۸/ جون ۱۸۹۸)

جواب رابع از حضرت گنگوہیؒ، عدم تقلید کے نقصانات:

از بندہ رشید احمد عفی عنہٗ

بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند:

خط آپ کا آیا، بہ ظاہر آپ نے جملہ مقدمات محررہ بندے کو تسلیم کرلیا اور قبول فرمالیا، البتہ تقلید شخصی کے سبب کچھ تردد آپ کو باقی ہے، لہٰذا اس کا جواب لکھواتا ہوں۔

مقید بامر مباح میں اگر مباح اپنی حد سے نہ گزرے یا عوام کو خرابی میں نہ ڈالے تو جائز ہے، اور اگر ان دونوں سے کوئی امر واقع ہوجائے تو ناجائز ہوگا۔ اس مقدمے کو خود تسلیم کرتے ہو؟ اب تقلید کو سنو کہ مطلق تقلید مامور بہ ہے۔ لقولہ تعالیٰ:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور بہ وجہ دیگر نصوص مگر بعد ایک مدت کے تقلید غیر شخصی کے سبب مفاسد پیدا ہوئے کہ آدمی بہ سبب اس کے لاابالی اپنے دین سے ہوجاتا ہے، اور اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع اس میں گویا لازم ہے اور طعن علمائے مجتہدین وصحابہ کرام اس کا ثمرہ ہے۔ ان امور کے سبب باہم نزاع بھی پیدا ہوتا ہے، اگر تم بہ غور دیکھو گے تو یہ سب امور تقلید غیر شخصی کے ثمرات نظر آئیں گے اور اس پر ان کا مرتب ہونا آپ پر واضح ہوجائے گا۔ لہٰذا تقلید غیر شخصی اس بدنظمی کے سبب گویا ممنوع من اللہ تعالیٰ ہوگئی۔ پس ایسی حالت میں تقلید شخصی گویا فرض ہوگئی، اس واسطے کہ تقلید مامور بہ کی دو نوع ہیں، شخصی وغیر شخصی، اور تقلید بہ منزلہ جنس ہے اور مطلق کا وجود خارج میں بدوں (بغیر) اپنے کسی فرد کے محال ہے۔

پس جب غیر شخصی حرام ہوئی بہ وجہ لزوم مفاسد تو اب شخصی معین مامور بہ ہوگئی، اور جو چیز کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہو اگر اس میں کچھ مفاسد پیدا ہوں اور اس کا حصول بدوں (بغیر) اس ایک فرد کے ناممکن ہو تو وہ فرد حرام نہ ہوگا، بلکہ ازالہ ان مفاسد کا اس سے واجب ہوگا، اور اگر کسی مامور کی ایک نوع میں نقصان ہو اور دوسری نوع سالم، اس نقصان سے ہو تو وہی فرد خاصہ مامور بہ بن جاتا ہے، اور اس کے عوارض میں اگر کوئی نقصان ہو تو اس نقصان کا ترک کرنا لازم ہوگا نہ اس فرد کا۔

یہ حال وجوب تقلید شخصی کا ہے۔ اسی واسطے تقلید غیر شخصی کو فقہا نے کتابوں میں منع لکھا ہے، مگر جو عالم غیر شخصی کے سبب مبتلا ان مفاسد مذکورہ کا نہ ہو اور نہ اس کے سبب سے عوام میں ہیجان ہو، اس کو تقلید غیر شخصی اب بھی جائز ہوگی، مگر اتنا دیکھنا چاہیے کہ تقلید شخصی وغیر شخصی دو نوع ہیں کہ شخصیت وغیر شخصیت دونوں فصل

ہیں جنس تقلید کی، کہ تقلید کا وجود بغیر ان فصول کے محال ہے، کیوں کہ یہ فصول ذاتیات میں داخل ہیں۔ پس اس کا حال قیود مجلس میلاد سے جدا ہے۔ بادی النظر میں یہ دونوں یک ساں معلوم ہوتے ہیں، ورنہ اگر غور کیا جائے تو واضح ہے کہ ذکرِ ولادت جدا شئے ہے اور فرش وفروش روشنی وغیرہ قیود مجوّزہ کوئی فصل ذکر کی نہیں، بلکہ امور منضمہ ہیں کہ بدوں (بغیر) ان کے ذکرِ ولادت حاصل ہوسکتا ہے۔ سو ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں۔ مع ہذا اوپر کے کلیے سے مباح منضم کا حال معلوم ہو چکا کہ جب تک اپنی حد پر ہوگا جائز اور جب اپنی حد سے خارج ہوا تو ناجائز، اور امور مرکبہ میں اگر کوئی ایک جز بھی ناجائز ہو جائے تو مجموعے پر حکم عدم جواز کا ہو جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مرکب حلال وحرام سے حرام ہوتا ہے؟ یہ کلیہ فقہ کا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس تقریر سے آپ کی اس طویل تقریر کا جواب حاصل ہو گیا ہوگا جو آپ نے دربارۂ تقلید لکھی ہے، لہٰذا زیادہ بسط کی حاجت نہیں ہے، کیوں کہ تم خود فہیم ہو۔

اس مسئلے کے باب عقائد میں سے ہونے کا سبب دریافت فرمایا ہے۔ سو غور کیجیے کہ جو امور مبتدع اور محدث ہیں ان سب کو ناجائز اور موجب ظلمت عقیدہ کرنا واجب ہے۔ پس یہ اعتقاد کلیات میں داخل ہے۔ اگرچہ عمل ان کا عملیات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کتب کلام میں جواز مسح خف وجواز اقتدا فاسق وجواز صلوٰۃ علی الفاسق وغیرہ بھی لکھتے ہیں، کیونکہ گو یہ اعمال ہیں مگر اعتقاد جواز وعدم جواز اعتقادیات میں داخل ہیں۔

آپ نے تشبہ منہی عنہ کی تعریف دریافت کی ہے، سو تشبہ امر مذموم میں مطلقاً حرام ہے، اور جو امر غیر مذموم مباح ہے وہ اگر خاصہ کسی قوم کا ہو تو بھی ناجائز، اور اگر بہ قصد تشبہ کوئی فعل کیا جائے تو وہ مطلقاً درست ہے، سوائے اس کے اور سب

درست ہے، اور یہ بحث ''براہین قاطعہ'' میں بسط سے لکھی گئی ہے۔ اس میں دیکھ لیں، اور یہ بھی استطرادًا لکھتا ہوں کہ شارح منیہ، شرح کبیری منیہ میں جو دہلی میں چھپ گئی ہے، صلوٰۃ الرغائب کی کراہت کے جو وجوہ لکھے ہیں ان کو آپ دیکھیں کہ مجلس مولود کا حال اس پر قیاس کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

رہا حبس دم سو وہ فی حد نفسہ مباح ہے، اور عقلاً اس میں چند منافع ہیں، جذب رطوبات اور جلب حرارت اور رفع تشتت خواطر۔ چناں چہ اطبا اس کو صراحتاً معالجہ رطوبت قلبیہ میں تحریر کرتے ہیں، اور ہر عاقل اس کو جان سکتا ہے، لہٰذا جوگیوں نے مورث صفائے باطن جان کر اس کو اختیار کیا، اور اسلامیین نے بھی اس وجہ سے اس کو اختیار کیا۔ جوگیوں کا فعل ہونے کی وجہ سے نہیں لیا، بلکہ عقلاً اس کو نافع سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اسی واسطے قادریہ وچشتیہ کے یہاں چوں کہ حرارت کی ضرورت ہے، انہوں نے اس کو موکداً اپنے اعمال میں داخل کیا، اور نقش بندیہ کے یہاں استحساناً کہ وہ حرارت کو ضروری نہیں جانتے، اور بعض درجے میں بعض وجہ سے یعنی بہ وجہ استحکام ذکر اس کو مستحسن سمجھتے ہیں، اور سہروردیہ کے ہاں چوں کہ حرارت کی مطلقاً حاجت نہیں، لہٰذا ان کے ہاں ممنوع ہے، بلکہ وصول کے واسطے عدم حبس کو شرط کرتے ہیں۔ پس اس کا اختیار کرنا اس ضرورت کے واسطے ہے۔

اور حبس خاصہ جوگ کا نہیں بلکہ یہ امر عقلی ہے کہ سب عقلاً اپنے اپنے موقع پر اس کو کرتے ہیں، اور نظیر اس کی شروع میں موجود ہے کہ تشہد میں رفع سبابہ کر کے ادامۃ النظر الی السبابہ مشروع ہے، اور غض بصر تحصیل خشوع کے واسطے اور غض بصر غیر محارم سے رفع تشتت کے واسطے۔ پس اس میں تشبہ کا کیا امکان ہے۔ یہ کوئی امر حسی نہیں اور نہ خواص کفار سے، اور متضمن منافع ضروریہ کا، لہٰذا اس کے

جواز میں کلام نہیں ہوسکتا، اور انگرکھا ہر دو فریق میں شایع ہے، اس میں تشبہ نہیں ہوسکتا، البتہ پردے کا فرق ہے سو اس میں تشبہہ حرام ہے۔ علی ہذا۔ رجعت قہقری خاصہ کسی قوم کا نہیں ہے۔

التزام مالایلزم بدوں (بلا) اعتقادِ وجوب بھی ممنوع ہے۔ اگر بہ اصرار ہو، اور اگر امر مندوب پر دوام ہو بلا اصرار وہ جائز ہے اور مستحب ہے، بہ شرطے کہ عوام کو ضرر نہ کرے، اور اگر عوام کے اعتقاد میں نقصان ڈالے تو وہ بھی مکروہ۔ چناں چہ کتب فقہ میں سُور مستحبہ کا التزام مکروہ لکھا ہے، اور سورۂ قل ہو اللہ احد کی صورت میں جو آپ نے لکھا ہے خود ہی غور فرماؤ کہ جب اس صحابی نے اس پر التزام کیا اور جملہ صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا تو اعتراض صحابہؓ کا اس التزام پر بلا وجہ شرعی نہ تھا، اسی واسطے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ امر پیش ہوا تو آپ نے صحابہؓ کو منع نہ فرمایا کہ اس پر کیوں اس کے ساتھ تکرار کرتے ہو؟ بلکہ خود ان کو بلا کر پوچھا کہ ان کا کہنا کیوں نہیں مانتے ہو۔ پس اگر یہ امر ناجائز و موہم نہ ہوتا تو آپ صحابہؓ کو ہی منع کر دیتے، اور جب اس شخص نے اپنی محبت کا حال بیان کیا تو اس وقت آپ نے ان کو اجازت دی کہ فی حد ذاتہ یہ امر جائز تھا اور فضل اس سورت کا محقق تھا، اور اس اجازت سے ایہام رفع ہو گیا تھا، کیوں کہ ایہام کا غیر مشروع ہونا سب صحابہؓ پر واضح ہو گیا، کیوں کہ اس وقت کے آدمی ایسے عوام کے درجے میں نہ تھے کہ باوجود اس واقعے کے پھر بھی اس کو واجب جانتے، اور پچھلوں کے واسطے یہ انکار صحابہؓ کا اور تقریر ان کے انکار کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہونا حجت ہو گیا، تو اس واقعے سے کچھ شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس بحث کو ''براہین'' میں بسط سے لکھا ہے، مگر آپ نے اس کتاب کو دیکھا ہی نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ''براہین'' کو اول سے

آخر تک بہ تدبر دیکھے تو باب بدعات میں اس کو کوئی شبہ نہ ہو، کیوں کہ اس کے مولف نے اس باب میں سعی بلیغ کی ہے۔ جزاہ اللہ خیرالجزاء!

اگر آپ کو بھی کوئی شبہ ہو تو بندے کی طرف سے اجازت ہے آپ اس کو ظاہر کریں۔ اگر گنجایش جواب ہوگی توان شاء اللہ تعالیٰ جواب لکھوں گا، ورنہ خیر! مگر تحریرات بندہ کو تدبر سے محفوظ کر کے اس کے بعد شبہ کرنا چاہیے۔ عوام علما کو جو جراءت ارتکاب بدعت کی ہوئی کلام اہل حق کے عدم فہم سے ہوئی۔ فقط

والسلام علیکم وعلی من لدیکم

۲۵ر محرم ۱۳۱۵ھ

(۱۸۹۷ء)

جواب از حضرت تھانویؒ، رجوع:

بہ والا خدمت بابرکت قدوۃ العرفاء زبدۃ الفضلا حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

تسلیم بہ صد تعظیم قبول باد!

والا نامہ شرف صدور لایا، معزز فرمایا۔

حضرت عالی کے ارشادات سے اسے عمل کے جو مفاسد علمیہ وعملیہ عوام میں غالب ہیں پیش نظر ہو گئے، اور ارادہ کر لیا کہ ہرگز ایسی مجالس میں شرکت نہ ہوگی۔ اب یہاں کی حالت عرض کر کے حکم کا انتظار ہے۔

الحمد للہ کہ میں یہاں نہ کسی کا محکوم ہوں نہ کسی سے مجبور، مگر پوری مخالفت کر کے قیام دشوار ہے گو اب بھی یہاں کے بعض علما مجھ کو وہابی کہتے ہیں، اور بعض بیرونی علما بھی یہاں آکر لوگوں کو سمجھا گئے کہ یہ شخص وہابی ہے، اس کے دھوکے میں مت آنا، مگر چوں کہ من وجہ عوام سے موافقت عملی تھی، اس لیے کسی کی بات نہ

چلی۔ اب چوں کہ شرکت عملی کا بھی ارادہ نہیں تو دقتیں ضرور پیش آئیں گی، اب تین صورتیں محتمل ہیں:

ایک یہ کہ ایسے مواقع پر کوئی حیلہ کر دیا کروں گا، مگر اس کا ہمیشہ چلنا محال ہے۔

دوسرے یہ کہ صاف مخالفت کی جائے، مگر اس میں نہایت شور وفتنہ ہے، جس کی حد نہیں۔ دنیوی مضرت یہ ہے کہ اس میں جہلا عوام سے ایذا رسانی کا اندیشہ ہے۔ دینی مضرت یہ ہے کہ اب تک جوان لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کی گئی سب بے اثر و بے وقعت ہو جائے گی۔ اس بدگمانی میں کہ یہ شخص تو وہابی ہے، اب تک پوشیدہ رہا۔

تیسری صورت یہ کہ یہاں کا تعلق ملازمت ترک کر دیا جائے، اور میں تو اس صورت کو بلا انتظار حکم عالی اختیار کر لیتا، مگر دو امر کا خیال ہوا۔ ایک یہ کہ خود سبب معیشت کو ترک کرنا اکثر موجب ابتلا وامتحان ہوتا ہے کہ خدا جانے اس کا تحمل ہو یا نہ ہو؟ اور اموال موروثہ کا تیا پانچا پہلے سے کر چکا ہوں، اور دوسری جگہ تعلق ملازمت سے اعلیٰ حضرت منع فرما چکے ہیں، اور میرا بھی دل نہیں چاہتا۔

دوسرا خیال یہ ہوا کہ بہ ظاہر پھر بقائے مدرسہ کا دشوار ہے، اور یہاں دین کا چرچا عوام وطلبا میں اس مدرسے ہی کے سبب ہے، ورنہ عوام میں دہریت خواص میں فلسفیت کا بڑا زور تھا، حضور کے امر سے یہ دونوں اندیشے مرتفع ہو جائیں گے، یعنی ان شاء اللہ مجھ کو بھی دشواری پیش نہ آئے گی یا اگر آئے گی تو اس کی برداشت کی قوت ہو جائے گی، اور مدرسہ بھی حضور کی دعا سے چلتا رہے گا۔ اب جو ارشاد ہو عمل میں لاؤں۔

یہاں ربیع الاول والآخر میں ان مجالس کی زیادہ کثرت ہے، سو اگر شق ثالث

کا حکم ہوتو اختتام صفر تک اس کا انتظام کرلوں۔ حقوق وغیرہ ادا کردوں۔ مدرسے کا کوئی مناسب انتظام بہ تدریج کردوں، اور اب سے ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی نیا کام بلا استجازہ حضرت والا کے وقوع میں نہ آئے گا، اور اگر غلطی سے کوئی امر صادر ہوجائے تو بے تکلف احقر کو متنبہ فرما دیا جایا کرے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ امتثال امر میں کوتاہی نہ ہوگی۔ اب جواب عریضہ کے ساتھ امر سے بھی اطمینان فرمادیا جائے کہ اب تو حضور کو کسی قسم کی ناخوشی اس خادم سے نہیں ہے۔ زیادہ حد ادب! بہ خدمت مولوی محمد یحییٰ صاحب سلام مسنون۔

اشرف علی از کان پور

۲۹ رمحرم ۱۳۱۵ھ

(۳۰ رجون ۱۸۹۷ء)

اس کے جواب میں حضرت قدس سرہٗ نے مولانا کے اس رجوع الی الحق کا شکریہ اور اس پر شاباش تحریر فرمائی، اور جواب الجواب میں مولانا مدظلہٗ کی طرف سے شکریہ آکر کتابت ختم ہوئی۔ ختم اللہ لنا بالحسنٰی۔ آمین!

(تذکرۃ الرشید: ج ۱ ص ۱۱۳ تا ۱۳۶)

ضمیمہ-۲

وصل الحبیب

تالیف: حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ

حضرت گنگوہیؒ کی وفات کا اثر:

قطبِ عالم، قدوۃُ العلماء الراسخین، اُسوۃُ الفقہاء والمحدثین، حضرت شیخ المشایخ مولانا ومرشدنا الحاج الحافظ المولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ایسی وفات نہ تھی جس کا اثر کسی خاص حصے یا مختص جمع تک قاصر رہا ہو۔ اِس جاں کاہ ورُوح فرسا حادثے نے تقریباً تمام مسلمانانِ ہند کے دِلوں کو علیٰ قدرِ المراتب صدمہ پہنچایا اور اُن مخالف فِرَقِ اسلامیہ کے قلوب پر بھی چوٹ لگائی ہے جن کی عناد پسند طبایع حضرت قدس سرہٗ کی مقدس حیات میں اس سچی نیابت رسالت کے فیضان سے محروم رہیں۔ عموماً حضراتِ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے لیے کچھ عادۃُ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ اُن کی پاک زندگی اور برگزیدہ اوقات میں عام مخلوق خلل انداز نہ ہو، اس لیے بعد وصال ہر دِل عزیز ہونے والے خاصانِ خدا کو کسی زمانے میں بھی اہلِ زمانہ نے متفقہ رائے سے پیش وا و اِمام نہیں سمجھا۔ ہاں! البتہ وہ قلبی کیفیت جس کو اِسلام سے

علاقہ ہے ہر مسلمان کے دِل سے اِس اَمر کا اِقرار کراتی رہی کہ یہ تقویٰ وریاضت ہم عصر ابنائے زمانہ میں مفقود ہے۔ چوں کہ حضرت محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس ذات نے بھی اس پاکیزہ اُصول سے علاحدہ ہونا نہ چاہا اور زندگی میں تسخیرِ عام اور کافّۂ اَنام میں نیک نامی وشہرتِ تامہ کو پسند نہ کیا، اِس لیے باوجود اِس کمالِ ظاہر وباطنی کے جس کی نظیر دُنیا میں اس صدی کے اندر نظر نہیں آئی، اسلام کے متعدّد فرقوں کی بدزبانی وایذا رسانی سے یک سو نہ رہے، اور تفسیق وتضلیل بلکہ تکفیر تک کے فتوے ہوئے۔

اِس زمانے نے ایک جگہ کی دُوسری جگہ، اور ایک ملک کی دُوسرے ملک میں خبریں معلوم ہونے کے اس قدر وسایل وذرایع مہیا کردیے ہیں کہ سطحِ زمین کا ہر آباد حصہ دُنیا بھر کے بھلے بُرے حالات گھر بیٹھے معلوم کرسکتا ہے۔ پس ہمارا یہ دعویٰ بداہت کے باعث دلیل کا محتاج نہیں ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کا توکل میں، صبر وقناعت میں، ریاضت وعبادت میں، تقویٰ وطہارت میں، مجاہدے میں، اِستقامت میں، اِستغنا میں، حب فی اللہ وبغض فی اللہ میں جس طرح کوئی مثیل نہ تھا۔ اسی طرح تبحر علمی میں، وسعتِ نظر میں، تفقہ میں، تحدیث میں، عدالت وثقاہت میں اور روایت ودرایت میں بھی کوئی عدیل نہ تھا۔ اِسی دعوے کو بہ الفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ شریعت میں مرجعِ علما اور طریقت میں ملاذ الناس ہونے کی حیثیت سے دُنیا میں بے نظیر یعنی عالم کے قطب الارشاد تھے۔

عوام مسلمین کے سمجھنے کے لیے یہ بات بھی کافی تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ عام اہلِ اسلام کے نہیں بلکہ خاص اور ممتاز سردارانِ مذہب یعنی علما کے اِمام تھے۔ اس لیے کہ حضرتؒ کے متوسلین کی کثیر التعداد جماعت میں کئی سو علما وہ

موجود ہیں جن کی قابلیتِ علمی کا فرداً فرداً بھی کسی جمِ غفیر کی لیاقت سے مقابلہ وموازنہ نہیں ہوسکتا۔ آخر وہ کیا خداداد خوبی تھی جس نے علما جیسے دُور بین اور وسیع النظر حضرات کو باوجود طلبِ جاہ وعلوّ اس عالی بارگاہ میں سر جھکانے اور گردن نیچی کر لینے پر مجبور کیا، اور مجبور نہیں بلکہ عوام سے زیادہ اِس اَمر کا حریص بنادیا کہ حضرتؒ کی مبارک جوتیاں سر پر اُٹھائیں، آنکھوں سے لگائیں، چومیں اور آخرت کے لیے ذخیرہ بنا کر رکھ چھوڑیں۔ ناظرین نظر اُٹھائیں اور دیکھیں یا دِکھائیں کہ پڑھے لکھے آنکھوں والے ذکی الطبع علمائے شریعت اور دیکھے بھالے واقف کارانِ رُموزِ طریقت کی اس بڑی جماعت نے جس مقدس فرشتہ سیرت ذات کو اپنا مقتدا و پیش وا بنایا تھا، کیا سمجھ کر بنایا تھا؟ اگر یہ مرتبۂ انسانی تحصیل پر موقوف ہے تو کوئی حاصل کر کے دِکھائے یا حاصل ہوا نمونہ پیش کرے۔ ہم دیکھنے کے منتظر اور منصفانہ موازنے کے لیے تیار ہیں۔

تبحرِ علمی میں یکتا:

یہ بات مسلّم ہے کہ سوائے اُن چند مسائل کے جن کو رُسوماتِ مروّجہ اور آبائی قدیم خیالات سے علاقہ ہے، کسی شرعی مسئلے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ کیا معنی، مساوی درجے پر بھی کسی عالم کا فتویٰ نہیں سمجھا گیا، اور عوام ہی نے نہیں بلکہ خواص نے بھی باوجود مخالفت وعناد اور حسد وعداوت اس سچی بات کو مان لیا کہ فی الواقع تبحرِ علمی اور وسعتِ نظر میں علومِ دینیہ کے اندر حضرتؒ کا ہم پلہ ہندوستان میں یقیناً اور دیگر ممالک میں غالباً کوئی نہیں، اور نیز یہ اِستقامتِ کاملہ بھی دُوسرے کو نصیب نہیں ہوئی، جس کا ظاہری ثمرہ یہ تھا کہ ابتدائے بلوغ اور آغازِ شباب سے اس عالمِ ضعیفی اور زمانِ پیری تک حضرتؒ کے معاملات میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ وہی سنن ومستحبات کی مداومت تھی اور وہی نوافل پر مواظبت۔

وہی تہجد واَوّابین تھی اور وہی چاشت واِشراق۔ وہی تحیۃ الوضو کی حالت تھی اور وہی تحیۃ المسجد کی کیفیت۔ انسانی زندگی کے متعلق پیش آنے والے اُمور یعنی موت، حیات، صحت، مرض، رنج وغم، راحت وخوشی، ولادت، عقیقہ، ختنہ ونکاح، غرض کنبہ وبرادری سے وابستہ جملہ ضرورتیں پیش آئیں، مگر کیا ممکن تھا کہ کبھی معمولاتِ ریاضت میں حبہ برابر فرق پیدا یا نوافل ترک ہو گئے ہوں؟ اِس پُرآشوب زمانے میں فرائض وواجبات پر بھی اس قدر اِستقامت مشکل امر ہے کہ چالیس پچاس سال میں کسی ایک نماز کی قضا یا جماعت کا چھوٹ جانا نہ پایا جائے، چہ جائے کہ نوافل ومستحبات۔ پس اگر اِس کا نام محبتِ رسول اور اِتباعِ نبیٔ عربی نہیں تو پھر کس کا نام ہے؟

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا فیض:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اِس رُوحانی سلسلے میں جو فیض حضرت محدث گنگوہی قدس سرہ العزیز کی متوکل وقانع اور مخلص ومتواضع ذات سے جاری ہوا یہ ذاتِ خود ایک آیۃ من آیات اللہ ہے، چہ جائے کہ اُس پر بے نظیر کمال اور کمال پر لاثانی تکمیل، اور تکمیل بھی ایسی بابرکت جس کے فیض یافتہ دس بیس، سو دوسو نہیں بلکہ پچاس ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ ہوں تو عجب نہیں۔

اللہ اللہ! وہ کیا غیبی کشش تھی جس نے گنگوہ جیسے قصبے کی صعوبتِ سفر کو شرفائے ہند کی کم زور اور پردہ نشین عورتوں تک کے لیے آسان کر دیا، اور اللہ عزّ اِسمہٗ کی پاک باز مخلوق کو جوق جوق اِس طرح کھینچ لیا جیسے مقناطیس آہن کو کھینچتا ہے۔ دُنیاوی حیثیت سے تعجب ہے، اور بسا تعجب ہے کہ گنگوہ میں باوجود ہر قسم کی دُنیاوی تکلیف مہیا ہونے کے کنارہائے ملک سے گروہا گروہ اہلِ اسلام سراور

آنکھوں کے بل اس جوش وخروش سے حاضر ہوتے دِکھائی دیے جولذیذ سے لذیذ نعمت اور پسندیدہ آرام وراحت کے مقام پر جاتے وقت بھی نظر آنا دُشوار ہے۔ قطع نظر اہلِ کشف کے مکاشفات اور صاحبِ دِل سالکین کی غیبی مطلعات کے، خود یہ حالت قطبیت کا اِظہار اور حرمان نصیب مسلمانوں کی بدقسمتی پر کفِ افسوس مل کر اس اَمر کا اعلان کر رہی تھی کہ خداوندتعالیٰ جلت قدرتہ کی عدم توفیق کا اندازہ کرو کہ بطحائی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سچی نیابت کے دریائے موّاج اور بحرِ ذخّار سے آس پاس کے لوگ محروم رہا کرتے اور کس طرح آنکھوں والے مسلمان موسلا دھار مینہ (بارش) کی طرح برسنے والی خداداد نعمت کے تقسیم ہوتے وقت دامن سمیٹتے اور رُوگردانی کیا کرتے ہیں۔ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ!

حضرت گنگوہیؒ کے مخالفین تقوے کی لذت سے بے بہرہ:

زیادہ قابلِ تعجب بلکہ لائق حسرت وافسوس جس کا قلق عمر بھر نہ جائے گا، یہ بات ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر اِعتراض کرنے والے مسلمان عموماً وہ حضرات تھے جو قطع نظر اپنی عملی حالت خراب اور تقویٰ وطہارت کی لذّت سے بے بہرہ ہونے کے حضرتؒ کی مقدس صورت تک دیکھنے سے ناکام اور معمولات واوقات کی پابندی یا ریاضت ومجاہدے کی روزانہ کیفیت تک کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔ خدا جانے اس اَن دیکھے تیر چلانے والی قوم کو بلا حالت معلوم کیے کسی ناشایستہ کلمے کے زبان سے نکالنے کی کیوں کر جرأت ہوئی؟ اور ایک ایسے شیخِ وقت پر بدن کو لرزا دینے والا کفر کا فتویٰ گھر بیٹھے لگا دینے کی کس طرح ہمت ہوئی؟ جس کا تقدس وتورّع اور مخلوق کی جفاشعاری واِیذارسانی پر صبر وتحمل کا نمونہ ڈھونڈا ابھی نہیں ملتا!

ہائے افسوس! وہ نورانی صورت مادرِ گیتی کی گود کے حوالے ہوگئی، اور وہ نحیف جسم روضۃ من ریاض الجنۃ یعنی پاک صاف لحد مسنونہ کے سپرد کر دیا گیا، جس نے ساٹھ سال سے زیادہ ریاضت و نفس کشی اور خوف و خشیت کے ساتھ کامل اِتباعِ سنتِ محمدیہ میں صَرف کیے، اور ہدایت و رہبری کے مہتم بالشان منصب کا بوجھ اُٹھا کر انجام تک پہنچایا تھا۔

مؤلف کی حق گوئی:

میں اِس حیثیت سے کہ ایسے محلّہ و شہر اور اُس خاندان و قبیلے میں پیدا ہوا تھا جس کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اَن دیکھی عداوت تھی، نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے آبائی خیالات کی اصلاح میں بڑی عرق ریزی و تفتیش اور اپنی پوری طاقت صَرف کرنے والی چھان بین سے کام لینا پڑا، جس کا نتیجہ میں اس وقت تحریر میں لاتا اور اپنی قسمت پر فخر کر کے دُعا مانگتا ہوں کہ بارِ اِلٰہ! اپنے بندۂ ناکارہ عاشق الٰہی کو اپنے پیارے اور مقبول ولی یعنی مرجعِ عالم، حضرت مرشدی مولانا المولوی ابوالمسعود محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں محشور فرمائیو، اور محض اپنے فضل سے جوڑے ہوئے علاقۂ مرضیہ پر دُنیا سے اُٹھائیو۔ آمین بحرمۃ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم!

پاک باز روح کی روانگی کا سماں:

مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا وقت اور مقدس و پاک باز رُوح کی روانگی کا وہ نرالا سماں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جس کی لذّت تا دَمِ مرگ دِل سے نہ نکلے گی۔ اِس آخری زیارت کی مشتاق نگاہ پر ہزار جانیں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے جو کفن کی گرہ لگانے سے ایک آن پہلے حاصل ہوئی تھی، اور اَب اُس کا حصول ممتنع و محال ہے۔

جمادی الاولیٰ کی تیرہ یا بارہ تاریخ کی شب کو آخرِ شب میں خنکی کی وجہ سے حضرتؒ حجرے میں تشریف لے گئے، اور حسبِ معمول صلوٰۃِ تہجد میں اپنے اللہ سے راز و نیاز شروع ہوگیا، اسی حالت میں بائیں پاؤں کی دو اُنگلیوں یعنی خنصر و بنصر میں ناخن سے کچھ نیچے کسی زہریلے جانور نے کاٹا، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بالکل اِحساس نہیں ہوا، اور یہ عدم اِحساس اگرچہ میرے اور آپ کے نزدیک قابلِ تعجب ضرور ہے، مگر حالت میں محو و مستغرق ہوجانے والے اور کسی خاص حضوری کی مشغولیت کے وقت تن بدن سے مدہوش و بے خبر بن جانے والے شیخ کے لیے کچھ بھی قابلِ تعجب نہیں۔ اگر کسی شخص نے کوئی شیدائی جوان اپنی معشوقہ کے جمال کی زیارت کرتے وقت دیکھا ہوگا تو وہ اِس فنائیت ومحویت کا اندازہ کرسکے گا۔ غرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے لیے وقتِ مقرّرہ پر حجرے سے باہر تشریف لائے اور مسجد کی جانب روانہ ہوئے، صبح کا سہانا وقت تھا، جھٹ پٹا ہو چلا تھا، خالص حنفیت کے مطابق اِسفار کی حالت میں نوری شعاعوں نے شب کی تاریکی مٹادی تھی، سفید کپڑوں پر خون کی سرخی ممتاز ہوکر نظر آرہی تھی، ....جو بہ حالتِ قعود پاؤں سے مس ہوتا ہے، خون آلودہ دیکھ کر ایک خادم نے جو باہر کھڑے تھے عرض کیا کہ حضرت! آپ کا کُرتا خون آلود ہے۔ چوں کہ نماز کو دیر ہوتی تھی، اس لیے کپڑے بدل کر حضرتؒ مسجد میں تشریف لے آئے اور نماز پڑھائی۔

بعد نماز جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حسبِ معمول چارپائی پر بیٹھنے کے لیے کھڑاؤں پاؤں سے علاحدہ کی تو اُن خدام کی نظر پاؤں کی اُنگلیوں پر گئی، جو اس اِتفاقیہ واقعے سے سراسیمہ و پریشان سامنے کھڑے تھے۔ اُس وقت نشانِ زخم سے معلوم ہوا کہ کسی جانور نے کاٹا ہے۔ حجرے سے وہ روئی مصلیٰ بھی باہر لایا

گیا جس پر حضرتؒ نے شب کو نماز پڑھی تھی۔ دبیز مصلیٰ خون میں اس قدر آلودہ تھا کہ نیچے تک اثر پہنچ گیا تھا۔

اِس اِتفاقیہ قصے سے خدام کی طبایع پریشان اور رائیں مختلف قایم ہوئیں۔ بعض کا خیال ہوا کہ رگ کا منہ کھل کر خود بخود خون نکلا ہے، اور اکثر کا یہ گمان تھا کہ چوہیا نے کاٹا ہے، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جب فرمایا یہی فرمایا کہ ''مجھے مطلق خبر نہیں، نہ کاٹتے وقت اور خون نکلتے وقت احساس ہوا، نہ اب کچھ تکلیف یا دَرد ہے۔''

میں اُس وقت حضرتؒ کی خدمت میں حاضر تھا، ایک شانِ خداوندی نظر آرہی تھی کہ خدام اِس طرح متحیر و پریشان اور سبب خروجِ دَم کے معلوم نہ ہونے سے متفکر وسراسیمہ ہیں، اور حضرتؒ پر ذرّہ برابر بھی تفتیش وفکر کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ اِس قصے کے بعد کئی دن میں گنگوہ حاضر رہا، مگر حضرتؒ کی زبان مبارک سے اِستعجاباً یا تذکرۃً بھی اِس قصے کا اِعادہ نہیں ہوا۔

یہ بات یقینی ہے کہ حضرتؒ کے پاؤں سے چھٹانک بھر سے زیادہ خون نکل گیا تھا، اور اِس واقعے کے اگلے ہی دن سے حضرتؒ پر ضعف واِنکسار اور غنودگی ونوم کی حالت زیادہ طاری ہونی شروع ہوگئی، مگر بسا تعجب ہے کہ نماز کے اوقات اور اَوراد ووظائف یا مشاغل ومعمولات کے اوان میں ذرّہ برابر فرق نہ تھا۔ وہی دو ڈھائی بجے سے فجر تک اور صلوٰۃِ صبح کے بعد سے تا فراغِ ضحیٰ ایک حالت پر قعود اور مراقبہ واَوراد کا اِہتمام تھا، اور وہی چاشت وزوال کے نوافل اور بعد ظہر تلاوتِ قرآن اور خلوت کے خاص مشاغل کا اِلتزام تھا۔ وہی صلوٰۃ الاوّابین تک کا کھڑے ہوکر پڑھنا اور وہی دو دو گھنٹے ایک پہلو پر ذِکر وفکر میں محویت واِستغراق۔ اگر فرق تھا تو یہ تھا کہ مسجد سے اُٹھتے وقت کبھی چکر آیا اور ایسا ضعف

غالب ہوا کہ خادم کو سنبھالنا پڑا، یا یہ کہ پلنگ تک پہنچتے ہی لیٹ گئے اور چند ہی منٹ میں نیند آ گئی۔ خلاصہ یہ کہ اُن اوقات کا اکثر حصہ جو بہ حالتِ جلوت خدام کے ساتھ تعلیم و ہدایت یا دُنیاوی ضروریات کے متعلق باتوں میں صَرف ہوتا تھا نیند میں گزرنے لگا، اور اَذان کے وقت سے دو چار منٹ قبل معاً آنکھ کھل جاتی اور حسبِ معمولِ قدیمہ سب سے پہلے پہلا لفظ جو زبان سے نکلا کرتا تھا بے اختیار نکلتا تھا، یعنی:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

یا- اَسْتَغْفِرُ اللّٰه، اَسْتَغْفِرُ اللّٰه

یا صرف- وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اِس حالت پر متعجب ہوتا اور سوچا کرتا تھا کہ خلافِ عادت اس قدر نوم کا غلبہ کیوں ہے؟ مگر اُس وقت سوائے اس کے کہ خون نکلنے کے باعث ضعف پر محمول کرتا اور کیا سمجھ سکتا تھا؟ اِس جواب سے میرا نفس ساکت ضرور ہو جاتا تھا، لیکن تسلی نہ ہوتی تھی۔ اب اُس کا نتیجہ ظاہر ہونے پر وہ صورت نظروں کے سامنے پھرتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ دُنیاوی اسباب میں تو سَمّی اثر کی ابتدا اور زہریلے مادّے کا صعود تھا، جس نے ظاہری مشغولیتِ خلق کے اوقات کو دُوسری جانب مصروف کر دیا تھا، اور دِینی حیثیت سے لقائے خداوندی کا وقت قریب آ جانے کے باعث فرطِ اِشتیاق اور جوشِ محبت نے اِستغراق و فنائیت میں مخلوق سے بالکل یک سو کر لیا تھا۔

اِس حالت میں حضرتؒ کے وہ خاص الطاف جو عام خدام پر مبذول ہوئے تھے اب یاد آ کر بہت مضطرب کرتے ہیں۔ آہ! کیا خبر تھی کہ یہ معمول سے زیادہ عنایتیں اس لیے ہیں کہ مہربانیاں کرنے والا دِینی باپ اپنی بے کس اولاد کو یتیم

بنانا چاہتا ہے، اور یہ مخصوص توجہات اس لیے بڑھی ہوئی ہیں کہ آخری اور بہت جلد ختم ہونے والی ہیں۔

اسی حالت کے ایام میں ایک مرتبہ عصر کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ جلوت میں بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرتؒ کے قریبی رشتے دار شاہ جی مظہر حسین صاحب حاضرِ خدمت ہوئے اور سلام کر کے حسبِ معمول مونڈھے پر بیٹھ گئے، یکا یک حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اثنائے گفتگو میں شاہ جی کی طرف توجہ کی اور یوں فرمایا کہ

''شاہ جی مظہر! آدمی کی زندگی کا اِعتبار نہیں ہے، ذرا علاحدہ ہو کر میری ایک بات سن لو!''

چناں چہ سہ دری میں تشریف لے گئے اور خدا جانے کیا فرمایا۔ چند منٹ کے بعد پھر پلنگ پر تشریف لے آئے اور سابق کلام پر گفتگو جاری ہو گئی۔

اِس بہ ظاہر بے محل اور بے موقع گفتگو سے سب کچھ ظاہر ہو چکا تھا، مگر اس پیش آنے والے جاں کاہ حادثے سے چوں کہ تمام خدام کے خیالات فارغ اور خالی تھے، اس لیے اس طرف توجہ بھی نہ ہوئی کہ کیا رمز و اِشارہ ہے؟

اُنگلیوں کے خفیف زخم کی جانب سے چوں کہ حضرتؒ نے خود اس قدر اِستغنا برتا کہ صرف مکھی بیٹھنے کی حفاظت کے لیے سوائے لعاب لگے ہوئے کاغذ کے کچھ دوا اِستعمال کرنے کا خیال بھی نہیں کیا، اس لیے خدام کو یہ بھی خیال نہ گزرا کہ یہ زخم اپنا اثر دِکھانے والا اور وصال کا پیش خیمہ بننے والا ہے۔ یہاں تک کہ ۲۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ ہجری مطابق ۳۱ر جولائی ۱۹۰۵ء یوم دوشنبہ (پیر) کو بعد نمازِ عشا جس وقت حضرتؒ حسبِ معمول چارپائی پر لیٹے اور خدام بدن دبانے لگے، یکا یک تپ ولرزہ محسوس ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں بخار نے یہ شدّت پکڑی

کہ چادر کے اُوپر ہاتھ رکھنا دُشوار ہوگیا۔ سہ شنبہ (منگل) کا تمام دن شدّتِ بخار میں گزرا، اور اتفاقی حالت سمجھ کر معمولی دوا اِستعمال میں آئی، لیکن چار شنبہ (بدھ) کو بھی جب بخار کی وہی شدّت رہی تو جناب صاحب زادہ حکیم حافظ مولوی مسعود احمد صاحب نے نہایت مستعدی سے تدبیر شروع کی، اور گو کبھی کبھی گونہ خفت محسوس ہوئی مگر بخار کو نہ جانا تھا نہ گیا پر نہ گیا۔

پاؤں کی اُنگلیوں میں جہاں سولہ سترہ دن ہوئے زخم ہوا تھا، کاٹی ہوئی جگہ پر نیلگوں چھالے پڑ گئے، اور خنصر و بنصر پر وَرَم محسوس ہوا۔ اس کے بعد وَرَم بڑھتا اور اُوپر کو چڑھتا رہا، یہاں تک کہ زانو تک پہنچ گیا اور حرکت تک سے معذوری ہوگئی۔ پیر کی یہ حالت اور بخار کی یہ کیفیت دیکھ کر لوگوں کا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ شاید سانپ نے کاٹا ہو؟ اس لیے اِس فن کے جاننے والے آدمی بھی بلائے گئے، مگر پیر کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ اُس کو دیکھ کر پوری رائے قایم نہ ہوسکتی تھی۔

۴ راگست یعنی یومِ جمعہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مخلص عزیز جناب مولوی حکیم محمد اِسماعیل صاحب اجمیری مقیم بمبئی نے علاج اپنے ہاتھ میں لیا، جو اِتفاقاً بمبئی سے آگئے تھے، اور حضرتؒ کے مزاج دان ہونے کے اِعتبار سے اطبا میں بھی ہر طرح قابلِ ترجیح سمجھے گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ معالجہ و تدبیر اور خدمت و تیمار داری میں حتی الامکان کوئی امر فروگزاشت نہیں ہوا، مگر حضرت قدس سرہ العزیز سفرِ آخرت کا تہیہ فرما چکے تھے، اِس لیے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، اور جمعہ کے دن ساڑھے بارہ بجے کے بعد ۸ ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ ہجری مطابق ۱۱ راگست ۱۹۰۵ء کو بعد اَذانِ جمعہ وہ وقت دیکھنا نصیب ہوا جس کا نقشہ مرتے دَم تک قلب سے علاحدہ نہ ہوگا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مرض کی اِطلاع اوّل دو چار دِن تک تو سوائے

مخصوص لوگوں کے قرب وجوار میں بھی کسی کو نہیں ہوئی، مگر جس وقت پھیلی تو متوسلین کی آنے والی جماعتوں کا یہ عالم تھا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ خدام اس کثرت سے جوق جوق آئے کہ خانقاہ میں باوجود وسعت جگہ نہ ملی۔ اکثر مختلف جگہوں میں ٹھہرے، اور باوجودے کہ اکثر آدمی زیارت کرکے واپس چلے جاتے تھے مگر پھر بھی تقریباً چارسو، پانچ سو اشخاص کا ہجوم رہتا تھا۔ چوں کہ یہ مجمع اکثر علما وصلحا اور حضرتؒ کے مخلص خدام کا تھا، اس لیے روزمرّہ متعدّد ختم کلام مجید، بخاری شریف، آیتِ کریمہ اور سورۂ فاتحہ وغیرہ کے ہوئے، اور نہایت تضرّع وزاری کے ساتھ دُعائیں مانگی گئیں، مگر میں یہ بات یقینی کہہ سکتا ہوں کہ دِل اندر سے بجھ چکا اور مایوس بن گیا تھا، جس کا خواص پر یہ اثر ہویدا تھا کہ عین حالت گریہ وبکا میں صبر کا وقت ہونے کی اطلاع دی جاتی تھی، اور عام پر یہ اثر ظاہر تھا کہ دِل کی بند ہوئی کلی باوجود کوشش کے کھلنے اور کِھلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حالتِ کرب وشدّتِ مرض ایک جداگانہ کمالِ تام کی دلیل بنی ہوئی تھی، اس لیے کہ بجائے ہائے واویلا اور آہ ووائے کے ''اللہ'' نکلتا تھا، جس کی ''ھ'' میں کشش اور مدِ صوت نمایاں تھا۔

آثارِ مرض یہ بات ظاہر کررہے ہیں کہ غالباً حضرتؒ کے پاؤں میں سانپ نے کاٹا اور اُسی کے زہریلے اثر نے شانِ صدیقیت میں حظِ وافر عطا کرنے کے لیے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ حضرتؒ کو چند روز عالمِ دُنیا سے کسی قسم کا بہ ہوش وحواس علاقہ نہیں رہا۔ زبان نے پوری طرح یاری نہیں دی۔ اگر کبھی کوئی بات فرمائی تو اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئی، مگر اس حالت میں بھی یہ بات ہر دیکھنے والا دیکھتا تھا کہ زبان پر ذِکرِ الٰہی جاری اور قلب اپنے کام میں بہ دستور مشغول اور دونوں ہاتھ اکثر نماز کی نیت باندھنے کی طرح کانوں تک جاتے مگر ضعف کے

باعث کپکپاتے ہوئے نیچے گرنا چاہتے تھے، جن کو اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے خادم تھام لیتے تھے۔

جمعہ کا انتظار:

حضرتؒ کو شنبہ (ہفتہ) کے دن سے جمعہ کا اِنتظار تھا۔ وہ چند باتیں جو کبھی کبھی سمجھ میں آئیں یہی تھیں، مثلاً فرمایا: ''کیا آج جمعہ کا دِن ہے؟'' یا ایک مرتبہ فرمایا کہ ''جو اللہ چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔'' ایک مرتبہ صاف الفاظ میں ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' پڑھا۔ ایک دفعہ صاحب زادہ صاحب کو اِرشاد فرمایا کہ ''میاں مسعود احمد! وضو کرادو''۔ یا یک شنبہ (اتوار) کے دن مولوی حبیب احمد صاحب خادمِ خاص سے فرمایا کہ ''پانچ روز اور خدمت کرنی ہے!'' اور آخری شب شبِ جمعہ میں اپنے جاں نثار خادم مولوی محمد یحییٰ صاحب کاتبِ خطوط وفتاوے کا خاص نام لے کر کچھ اِرشاد فرمایا، مگر وہ نہ سمجھ سکے اور بے تابانہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو چھ روز پہلے سے جمعہ کا انتظار تھا۔ بہ یومِ شنبہ (ہفتہ) دریافت فرمایا کہ ''آج جمعہ کا دِن ہے؟'' خدام نے عرض کیا کہ حضرت! آج تو شنبہ ہے۔ اس کے بعد درمیان میں بھی کئی بار یومِ جمعہ کو دریافت فرمایا، حتیٰ کہ جمعہ کے دن جس روز وصال ہوا، صبح کے وقت دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے؟ جب معلوم ہوا کہ جمعہ ہے تو فرمایا: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ''

اَیامِ مرض میں زبان بہت سرعت سے ذِکر کے ساتھ جاری رہتی تھی۔ جو اوقات اَورادِ معینہ کے تھے اُس وقت خود بخود اُس طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ ۴؍ اگست کو جو جمعہ واقع ہوا، اُس میں حسبِ معمول وقتِ مقررہ پر سورۂ کہف شروع کر دی۔ خصوصاً تہجد کے وقت زیادہ مشغولی اور توجہ معلوم ہوتی تھی۔ بعض

دفعہ ذِکرِ نفی اِثبات جہراور مدِ صوت کے ساتھ شروع فرما دیتے۔ایک دفعہ بیٹھنے کی حالت میں حبسِ دَم کی طرح سانس کو دیر تک روکے رکھا، جس سے طبیبوں کو دُوسرا اَندیشہ پیدا ہو گیا، مگر جب دیر کے بعد آہستہ آہستہ چھوڑا تو معلوم ہوا کہ صورت دُوسری تھی۔ اکثر اوقات ہاتھ کو وہ حرکت پیدا ہوتی تھی جو تسبیح کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے کے وقت ہوتی ہے۔ یہ حالت خاص کر اُن اوقات میں جو دُرود شریف وغیرہ پڑھنے کے تھے، زیادہ ہوتی تھی۔ایک دفعہ ہاتھ بڑھا کر تسبیح کی تلاش کی، خدّام نے تسبیح ہاتھ میں دے دی، جس کو بالکل باقاعدہ دیر تک پڑھتے رہے۔

دنیا کا ہوش نہیں اور عالم بقا سے غفلت نہیں:

الغرض! قلب و دِماغ اور زبان و دیگر اعضا سب اُسی طرف متوجہ تھے، اِس عالم کا بالکل ہوش نہ تھا۔ اِس وقت مجھ کو وہ مقولہ یاد آتا ہے جو حضرتؒ کے ایک جلیل القدر متوسل نے پاس بیٹھ کر دیر تک توجہ باطنی میں مشغولیت کے بعد آہِ سرد بھر کر شبِ جمعہ میں فرمایا تھا کہ

> ''حضرت کو ذرّہ برابر اِس عالمِ فانی کا ہوش نہیں، اور اِس کے ساتھ ہی حبہ برابر اُس عالمِ بقا سے غفلت نہیں۔''

اللہ! اللہ! بخار کی اِس شدّت اور کرب کی اس زیادتی میں، جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں کے قلوب مصدوم ہوتے تھے، ذِکر و فکر کی یہ حالت تھی کہ بہ حالتِ مرض اکثر کسی خادم کے سہارے کمر لگا کر بیٹھتے تو اُسی حالت پر بیٹھتے جس طرح بہ حالت مراقبہ ساکت وصامت بیٹھنے کی عادت تھی۔ اِس عالمِ محوِیت کے ان حرکات وسکنات سے ایک معمولی سے معمولی ظاہر بین شخص بھی کم سے کم یہ نتیجہ ضرور نکال سکتا ہے کہ اللہ عزّ اِسمہٗ کی یاد اور اَذکار کے معمولات حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بالکل عادتِ جاریہ اور طبیعتِ ثانیہ بن چکے تھے، جن کے لیے تکلف

وتوجہ اور دُنیاوی ہوش وحواس کی بھی حاجت نہ رہی تھی۔ کیوں کہ بلاقصد وبلاارادہ بھی وہی بات پیدا ہوتی تھی جس کو مقصود بالذّات بنانے کے لیے سیکڑوں برس کوشش اور مجاہدے یاریاضتیں تجویز کی گئی ہیں۔

مشتاقانِ زیارت کے ہجوم کی کیفیت ایک جداگانہ شانِ قطبیت کا اِظہار کر رہی تھی۔ صاحب زادہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے لیے مرجعِ عالم شیخ اور کئی ہزار مخلوق کے مشفق ومہربان باپ کا مرض ہی کیا کم پریشان کرنے والا تھا؟ پھر اُس پر تیمارداری اور تیمارداری کے متعلق زائرین کے بے تابانہ ہجوم کا انتظام، بے چین خدام کی تسلی وتشفی، اور سب پر طرّہ یہ کہ زیارت کے شوق میں کھنچے چلے آنے والے عشاق، متوسلین کی مہمان داری اور کھانے کا اِنصرام جس میں پانچ پانچ سو تک شمار پہنچتی تھی، یہ سب پریشانیاں بہ حیثیت مجموعی ایسی مہتم بالشان تھیں جن کی برداشت کے لیے بڑے دِل جگرے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ کسی جان سے زیادہ عزیز کی بیماری میں ایک مہمان کو وقت پر کھانا پہنچانا بھی گراں گزرتا ہے، اوراسی تواترِ تفکرات کو دیکھ کر اکثر خدام زیارت کرکر کے واپس ہوجاتے تھے، مگر پھر بھی دن بہ دن مجمع بڑھتا گیا، اور یہ حالت ہوگئی کہ سہارن پور میں گنگوہ جانے کے لیے بہلی اور یکہ (گھوڑا گاڑی) یا ٹمٹم (دو پہیوں کی انگریزی گاڑی) اور ٹٹو (چھوٹے قد کا گھوڑا) تو کیا ملتا، چھکڑا بھی بارہ بارہ رُپیہ پر کرایہ ہوا، اور آخر وہ بھی نہ مل سکا تو جاں باز عشاق کو پیدل مسافت طے کرنی پڑی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا چیز تھی جو اُن ناز پروردہ جوانوں کو بیس بیس کوس پیدل بھگائے لیے جاتی تھی جن کو کبھی کوس بھر بھی پیدل چلنے کا اِتفاق نہیں ہوا؟ اور وہ کیا جوش تھا جس نے اس شوق میں کہ کسی طرح پَر لگ جائیں اور گنگوہ اُڑا لے جائیں؟ تاریک رات کے اندھیرے میں چل دینے پر ایسا مجبور کردیا تھا کہ

صبح ہونے کا انتظار گویا مہجور عاشق کو شبِ ہجر کی صبح کا اِنتظار تھا، جس کی برداشت آسان نہ تھی۔ اِن نظارے کے محتاج دُور و دَراز سے سمٹے چلے آنے والوں کو پردہ اُٹھا اُٹھا کر دُور سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کرادی جاتی تھی، مگر یہ پیاس وہ نہ تھی جو اس قلیل سیرابی سے بجھ جاتی، دِل تھا کہ نکلا چلا جاتا تھا، آنکھیں تھیں کہ اُمڈی آتی تھیں۔ بے محابہ جی چاہتا تھا کہ نگاہ یا تو اُس مقدس چہرے سے جدا نہ ہو جس کی زیارت کے شوق نے یہاں کھینچا ہے، اور یا اُن مبارک تلووں سے مَل کر حسرت پوری کریں جس کی نورانی صورت پر دِل لوٹا جاتا تھا۔

چہارشنبہ (بدھ) کی شام کو بعد صلوٰۃِ عصر جس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے سے پردہ اُٹھا ہے اور غلاموں کو زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے، حضرتؒ مراقبے کی طرح گردن جھکائے تکیے سے سہارا لگائے بیٹھے تھے۔ میں قسمیہ عرض کرتا ہوں کہ دِل اُس وقت کے رُوحی حظ کا اِس وقت تک مزہ لے رہا ہے، اور اگر کوئی شخص مبالغے کا جھوٹا اِلزام مجھ پر نہ لگائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے نظیر حالت صرف اُسی وقت کے لیے مخصوص تھی۔ عام طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ رحمتِ خداوندی بارش کی پھوار کی طرح برس رہی، اور تجلیات کا اس طرح وُرود ہو رہا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی کسی محدود روشن دان میں ہو کر کسی حسین صورت پر پڑ کر چمک دمک دکھلایا کرتی ہے۔ اِس عمر بھر یاد آنے والی حالت سے وہی دِل خوب آگاہ ہیں جن کی آنکھوں نے یہ سماں دیکھا ہے، اور اسی ربانی تجلیات کا ثمرہ تھا کہ باوجود اُس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سکون وطمانیت اور رَفعِ کرب وشدّت کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کا دِل نہ بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو نہ ٹپک پڑے ہوں۔ کاش! کوئی پوچھتا کہ صاحبو! کیوں روتے ہو؟ حضرتؒ تو اس وقت تن درستوں کی طرح بالکل خاموش بہ حالتِ

مراقبہ بیٹھے ہوئے ہیں؟

الغرض! وہ جمعہ کا دِن آ پہنچا جس کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ہفتہ کے دِن سے اِنتظار تھا۔ اِس دن کوئی خاص تغیر ایسا نہیں پیدا ہوا جس سے کسی خادم کی طبیعت ہراساں ہو، بلکہ بہ نسبت ایامِ گزشتہ کے سکون زیادہ معلوم ہوتا تھا، مگر اس دن کے صرف یومِ جمعہ ہونے کی وجہ سے اکثر خدام کے دِل دھڑک رہے تھے اور طبیعتیں کھٹک رہی تھیں، تاہم یہ کسی کو خیال نہ تھا کہ یہ طویل سفر اِس عجلت کے ساتھ طے ہوجائے گا کہ اطبا کو بھی نبض کے تغیر دیکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ بارہ بجے سے قبل خدام کے سارے مجمع نے بہ اطمینان کھانا کھایا اور واپس آ کر نماز کے تہیے میں مشغول ہوئے کہ یکا یک کلیجوں کی نکال لینے والی وحشت اثر خبر کانوں میں گونجی اور غلاموں کے منتشر مجمع میں ایک ہلچل اور بھاگا دوڑی مچ گئی۔ آگے پیچھے سراسیمہ و پریشان خدام حاضر ہوئے، دیکھا تو قبضِ رُوح شروع ہولیا تھا۔ اللہ اللہ! کیا وقت تھا اور کیا سماں تھا۔ اس ہیبت وجلال والی بارگاہ میں جہاں پاؤں کی آہٹ کو دبا دبا کر حاضر ہونا اور اَدب ونیاز کے ساتھ فاصلے پر ساکت وصامت کھڑا ہونا پڑتا تھا، کئی سو متوسلین کا اژدحام کچھ عجیب تغیرِ عظیم دِکھا رہا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ چارپائی پر مستحضر للموت لیٹے اور قبلے کی جانب رُخ کیے ہوئے مسکراہٹ کے ساتھ اسمِ ذات کے ذِکر میں مشغول تھے، اور بے چارے بے کس وبے بس عشاق اِردگرد غٹ کے غٹ اور اُوپر تلے ایک دُوسرے پر بے تابانہ جھکے پڑتے تھے۔ صاحب زادہ صاحب اور بعض دُوسرے خدام سورۂ یٰسٓ پڑھ رہے تھے، اور جملہ دِین داروں کا مجمع بہ حالتِ بے تابی کلمہ واِستغفار جو کچھ زبان پر آتا یا جو سورتِ قرآنیہ خیال میں آتی روتی ہوئی آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔ قلم میں طاقت نہیں کہ وہ نقشہ کھینچ دِکھائے، اور زبان کو یارا نہیں کہ اُس

حالت کو من وعن کہہ سنائے۔ جو آنکھ تھی وہ اَبرِ باراں بنی ہوئی تھی اور جو شخص موجود تھا وہ ششدر و حیران بنا کھڑا تھا۔ کتابوں میں پڑھے ہوئے قصے دِل کی آنکھوں کے سامنے تھے اور اولیائے کبار کی موت و وصال کے حالات آنکھوں سے دیکھ لینے کے منتظر، اور اُمیدوار اَشخاص وہ حال مشاہدہ کر رہے تھے جس پر کروڑہا زندگیاں قربان اور ہفت اقلیم کی سلطنت نچھاور! اِدھر قبضِ رُوح شروع ہوا اور اُدھر متوسط آواز میں مزہ لینے والے لہجے میں حضرتؒ کی زبان سے نکلا:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

جس کو پاس کھڑے ہوئے خدام نے صاف سنا اور اس کے بعد متصل ہی گونہ کراہت کے ساتھ چہرہ پھیر کر:

"لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ"

فرمایا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے اور سُننے والے سن رہے تھے۔ کسی پردے کے پیچھے کچھ ہونے والی حالت کا اِس طرح اِظہار ہو رہا تھا کہ گویا شیطانِ لعین اپنی اِنتہائی کوشش میں جی توڑ کر سرگرم ہے، اور فضل و کرمِ خداوندی اُس کی کمر توڑنے کے لیے حضرتؒ کی مقدس زبان سے "لاحول" کے دُرّے کی ضرب لگوا رہا ہے۔ اس کے بعد یا پاؤں میں دَم تھا یا ناف میں آیا، اور یا ناف میں تھا یا سینے میں آیا، جس وقت سینے میں دَم آیا اُس وقت کچھ نہیں تو سو سوا سو خدام کا غٹ ہو لیا تھا۔ اُن سے پوچھیے کہ کیا حالت دیکھی؟ سانس جلدی جلدی آ رہا اور سینے سے واپس ہو جانے والا سانس بہت ہی عجلت کے ساتھ "اللہُ، اللہُ، اللہُ" کا مبارک لفظ زبان سے نکلوا رہا تھا۔

آہ! خدا جانے وہ ضعف اُس وقت کہاں گیا جس کے باعث ابھی چند منٹ ہوئے بات بھی نہیں ہو سکتی تھی، اور سمّی اثر کے باعث پیدا ہونے والی زبان کی

کاوٹ کہاں چلی گئی جس نے حالتِ مرض میں خدام کو بات نہ سمجھنے دی تھی۔ کیسی صاف آواز تھی اور کیسا صاف لہجہ۔ غرض! کام کرنے والے مقدس فرشتے اپنے کام میں مشغول تھے اور دو منٹ کے بعد اللہ کی یاد کے ساتھ اطمینان حاصل کرنے والی رُوح گردن میں آپہنچی تھی۔ اُس وقت تو ڈھائی سو تین سو اَشخاص کا مجمع ہولیا تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی آواز پست وکم زور ہوچکی تھی، سانس کی گزرگاہ صرف حلق کا حصہ باقی تھا، مگر اللہ کے ذِکر کا تحرک بجنسہٖ قایم اور جلدی جلدی دہانے کی حرکت اور بہت ہی خفیف آواز میں ذِکرِ اِسم ذات جاری تھا، حتیٰ کہ اِس مبارک نام کی ہائے پر سانس کا اِختتام ہوگیا، اور کھلی ہوئی آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ گویا یتیم بننے والے خدام سے رُخصت کا اِظہار صرف وہ آنکھیں بند کرلینے کے ساتھ تھا، جس کی محبت بھری نظروں کے کیمیائی اثر نے گنگوہ کو حجازِ اَصغر بنادیا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

روح کی روانگی اور خوش بو:

سارا مجمع گواہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رُوحِ مقدسہ کے عالمِ بالا کی جانب روانہ ہوتے وقت وہ قدرتی مہکی ہوئی خوش بو ساری خانقاہ میں یک دم دوڑی اور ہر چھوٹے بڑے کے سونگھنے میں آئی، جس کو دُنیاوی خوش بوؤں سے کوئی مناسبت نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھ کو یا میرے احباب کو اُس وقت اِس کے سوا کچھ خیال نہ تھا کہ شاید سہ دری میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی چارپائی کے پاس بخورات سلگائی گئی ہیں، مگر جب دیکھا کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا اور خیال کیا کہ حقیقت میں اِس رواروی اور صرف پانچ منٹ کے نزع وتہیہ سفر کی عجلت میں کسی کو خوش بو سلگانے کا وقت ہی نہیں ملا تو بے اختیار یہ تمنا ہوئی کہ کاش! اس مرتبہ تقرّب کے ناواقف معاند اصحاب اسی وقت حاضر ہوتے اور اس آخری لٹنے والی

نعمت ہی سے دامن بھر لیتے؟ مجھے خیال تھا کہ اس حالت کو سننے والے حضرات شائد حسنِ ظن یا مدحِ مرشد پر محمول کر کے مبالغہ آمیزی کا اِلزام لگائیں گے، اس وجہ سے اِظہار میں تامل رہا، مگر مخالفین کے خیالات کے موافق جب اس کی تائید اس طرح ہاتھ آئی کہ اسی میرے وطن میں ''اِلٰہ بخش'' نامی جن کی زبان سے اُن لوگوں کے سامنے جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عناد تھا، حضرتؒ کے کمال کا اقرار اور اِس مہکنے والی خوش بو کا اِظہار ہوا تو مجھ کو عام اَحباب میں اِس کے تذکرے کی جرأت ہوگئی۔

اِلٰہ بخش نے اُس مجمع میں بہ جواب دریافت حالِ وصال آں حضرتؒ یہ الفاظ کہے تھے:

''مجھے حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کا بڑا صدمہ ہے۔ میں اُس وقت گنگوہ میں موجود تھا۔ وصال کا عجیب نظارہ میں نے خود دیکھا اور قبضِ رُوح کے وقت ایک نفیس خوش بو سونگھی جو ساری خانقاہ میں مہکی تھی، اور جو آدمی وہاں موجود تھے، اُنہوں نے بھی سونگھی ہوگی۔''

مبتدعین کے الزامات اور حضرت گنگوہیؒ کی وفات کی کیفیت:

خدا کی اس دُوسری مخلوق کے اِظہارِ منقبت کے طویل قصے کا بہ قدرِ کفایت فقرہ اِس محل پر میں نے ظاہر کر دیا ہے، ورنہ مجھے اس کی حاجت نہیں، کیوں کہ اس مجمع حضار میں بعض لوگ وہ بھی موجود تھے جو محض امتحان و آزمایش اور اس آخری نازک حالت کی جانچ کے لیے آئے ہوئے موجود تھے۔ اُن کے دِل اور آنکھیں اس بات پر اِیمان لے آئیں کہ اللہ کے مقرّب بندوں اور بطحائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار شہدا و صدیقین کا آخری وقت ایسا ہوا کرتا ہے، اور کیا عجب

ہے کہ ان اُمورِ بدیہیہ کا اِظہار صرف اسی لیے ہوا ہو کہ اب آخر میں معترضین کی زبانیں بند ہو جائیں، ورنہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی فنائیت واِستغراق اور رگ وپے میں ذِکرِ اِلٰہی کی سرایت اِظہارِ کمال کے لیے ہرگز ہرگز ذِکرِ لسانی کی محتاج نہ تھی۔

پس اگر ہم اُن لوگوں سے یہ سوال کریں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ کیوں صاحب! کیا پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق اور حق جل شانہٗ کی صفتِ ذاتی کے متعلق ایک گستاخ شخص کی موت ایسی ہوا کرتی ہے جیسی آپ نے حضرت گنگوہیؒ کی دیکھی؟

اللہ اللہ! یہی شیخ تو تھے جن کی طرف یہ اِلزام لگائے گئے ہیں کہ

"خدا کو جھوٹا بتاتے ہیں"،

"سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے برابر کا بھائی کہتے ہیں"،

"تعظیمِ نبوی کو حرام بتاتے"،

"کوّے کو حلال کہہ کر حرام کو حلال کرتے"

اور طرح طرح کی بد دِینی اور گستاخی کے کلمات سے خلقِ خدا کو گم راہ کرتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے خیالات کے موافق گم راہ کرنے والے شخص کی موت تھی، اور یہ مبتدعین کے بہتان کی بنا پر جہولِ زمانہ اور ضال مضل کے آخری وقت کا سماں تھا، جس پر اِسلام کے جملہ فرقے متفقہ رائے سے ایک حکم لگا سکتے ہیں، مگر افسوس! ان اقوال کے قائلین میں سے جن کو یہ آخری سماں بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا اور وہ دُنیا میں اپنے سوا کسی مسلمان کو سچا سمجھتے ہی نہیں، پس اُن کے ماننے کی اُمید نہیں۔

مگر ہاں! کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ کے ناطق حکم نے قائلین کے اِس آخری

وقت کا اُمیدوار ہمیں بنا رکھا ہے۔ آج حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے جو وقت تھا کل کو دُوسروں کے لیے بھی وہی وقت درپیش ہے۔ یہاں کا تو جو کچھ تھا مخالف وموافق سب نے دیکھا اور سنا، اب دیکھیے اس موت کو بد دِین کی موت سمجھنے والے مسلمان اپنی موت کے وقت کیا سماں دِکھاتے اور کس حال میں اپنی رُوح فرشتوں کے حوالے کرتے ہیں؟ فَانْتَظِرُوْٓا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

وصال کے بعد چہرۂ انور کی کیفیت:

میں اپنے دِلی جوش کو اس وقت ضبط نہیں کرسکتا۔ میں خدا کو حاضر ناظر سمجھ کر کہتا ہوں کہ وصال کے وقت یعنی رُوح کے پرواز کرتے ہی جو نوری شعاعیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، وہ میں نے کبھی حیات میں بھی نہیں دیکھیں۔ حال آں کہ بارہا زندگی میں زیارت کا اِتفاق ہوا، مگر بہ خدائے لایزال! وہ ملاحت وحسن اور وہ رُخساروں کی سرخی وچمک جو بعد وصال اُس مکھڑے پر نظر آئی عمر بھر نظر نہیں آئی۔ باوجود اِس شدّتِ مرض اور کرب وتکلیف کے جو ضعیف ومسن شخص کو کیا معنی، زبردست سے زبردست جوان کے سرخ وسپید چہرے کو جھلسا دینے اور منہ پر ہوائیاں اُڑانے اور جھریاں ڈالنے کو کافی تھی۔ خصوصاً رُوح نکلنے کے بعد جس کا بھیانک اور خوف ناک منظر پیاری اولاد کے چہرے کو بھی ڈراؤنا بنا دیتا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جسم گویا وہ جسم ہی نہ تھا جو زِندگی میں تھا۔ ایک جنتی گوری گوری رنگت والی حور تھی جو خانقاہ کی سہ دری میں نہا دھو کر پلنگ پر آلیٹی تھی۔

صاحبو! خدا کے واسطے مجھے فرطِ محبت میں ڈُوبا ہوا مخبوط الحواس نہ سمجھنا، جس کی بات کا اِعتبار نہ رہے، اور اگر ایسا بھی سمجھو تو اس کی وجہ بتلانا کہ آخر زِندگی میں اُس صورت پر اتنا تعشق کیوں نہیں ہوا؟ مرنے کے بعد وہ کیا خوبی پیدا ہوئی تھی

جو زِندگی میں نہ تھی؟ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس وقت میری نگاہ نعش مبارک پر پڑی اور چہرے پر جا کر ٹھہری ہے ہٹانے کو جی نہیں چاہتا، اور بے اِختیار دِل ٹوٹتا تھا کہ کاش! کوئی روکنے والا یا بے صبرا بتانے والا نہ ہو اور میں اس مقدس پیشانی کا بوسہ دے لوں۔ رُخساروں کی سرخی تھی کہ گویا انار نچوڑا گیا ہے۔ چمک تھی کہ گویا روغنِ چنبیلی ملا گیا ہے۔ مجھے تعجب تھا اور عمر بھر رہے گا کہ آخر اسی جسم پر نیلا بنا دینے والا زہریلا اثر اور کامل نو دِن کا سخت مرض بخار و سرسام کا پڑا ہے، پھر اُس جسم پر معمولی مسلمان اموات کا تغیر تک نہیں، بلکہ زندگی سے بدرجہا زیادہ اور ایک حیرت میں ڈالنے والا خوبی وحسن اور ملاحت وصباحت کا تبدل واقع ہوا ہے، اور کھلی آنکھوں یہ بات نظر آرہی ہے کہ کوئی نورانی بوچھاڑ آسمانی سطح سے مسلسل اِس چہرے سے آکر ٹکرا رہی ہے، جس کی گول ٹکیہ تمام یگانوں اور بے گانوں کی زیارت کے لیے کھلی ہوئی ہے۔

عشاق وخدام کی اِس جانکاہ حادثے پر جو کچھ بھی حالت ہونی چاہیے اُس کا ہر صدمہ اُٹھایا ہوا دِل اندازہ کرسکتا ہے۔ خصوصاً ایسی یتیم بن جانے والی اولاد کی حالت جس نے دُنیا ودِین میں سب سے زیادہ عزیز ومہربان باپ کی دُنیاوی مفارقت کا صدمہ اُٹھایا اور اس عمر بھر کی جدائی کے سفر کا سامان بندھنے اور رحلت کرنے کا آخری سماں آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ بھی ہو جائے قابلِ تعجب نہیں۔

حضرتؒ کے وصال کے بعد خلاف شرع امور سے پرہیز:

ایسے محبوب اور عالم کے مشہور مقتدا کا وصال ایسا نہ تھا جس پر سخت دِل سے سخت دِل بھی نہ چیخ اُٹھے، چہ جائے کہ ناز کے ساتھ پالی ہوئی وہ رُوحانی اولاد جس نے باپ کے سایۂ عاطفت کے اُٹھ جانے کی بھی اِس ظلِ ہدایت کے ہوتے ہوئے پروانہ کی ہو، جو کچھ بھی دہاڑتی کم تھی اور جتنا بھی ہائے واویلا اور

شوروغل مچاتی شاید معذور سمجھی جاتی، مگر اللہ اکبر! ایک قدرتِ خداوندی کی شان نظر آرہی تھی کہ بیس بیس سال کی پرورش کی ہوئی اولاد سے بھی خلافِ شرع کوئی حرکت تک صادر نہیں ہوئی، بلکہ جس نے جتنی مدّت زیادہ فیض حاصل کیا تھا اُسی قدر صبر واِستقلال کی ترازو میں وزنی اور گراں اُترتا تھا۔ وہ حاضر باش غلام جو گھر چھوڑ چھوڑ کر دس دس اور بارہ بارہ برس سے شیفتہ جمال بن کر اُس دروازے پر پڑے ہوئے تھے، اپنے دِینی سردار کے رُخصتی سامان اور تجہیز وتکفین میں اس طرح مشغول تھے جس طرح اولاد کو کرم گستر باپ کے سامانِ سفر کا تہیہ کرنا چاہیے۔ دم بخود ششدر وحیران، ساکت وصامت، ہاتھوں سے دِل تھامے، بغلوں میں ہاتھ دیے اور سینہ دبائے ہوئے ضرور تھے۔ آنکھیں اَبرِ نیسان کی جھڑی برسارہی تھیں۔ ایک ایک قدم من من بھر کا بنا ہوا اور بہ مشکل اُٹھائے اُٹھتا تھا، مگر کیا مجال تھی کہ چیخ نکل جائے یا گریبان پر ہاتھ جا پڑے!

جمعہ کی نماز کا نقشہ اور اتباعِ سنت:

اللہ اللہ! ابھی ابھی یہ پتھر کا کلیجہ شق کردینے والا قصہ نظروں کے سامنے گزرا ہے، اور اَبھی چوں کہ اَذانِ جمعہ ہوچکی ہے اس لیے نماز کی تیاری میں وضو ہو رہے اور اُس مسجد میں صف باندھے خطیب کے منتظر بیٹھے ہیں، جس میں گزشتہ جمعہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے منبر پر کھڑے ہوکر خطبہ سنایا اور نماز پڑھائی تھی۔

صاحبو ذرا غور کرو! پروانہ وار عاشقوں کی طبیعتوں کا اُس وقت کیا حال ہوگا جن کی نگاہوں کے سامنے سات دن قبل کے جمعہ کا یہ نقشہ جما ہوا تھا کہ اب جُبّہ پہنے، عصا ہاتھ میں لیے، سبز عمامہ باندھے اور کھڑاؤں پاؤں میں پہنے ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف لاتے اور منبر پر کھڑے ہوکر خطبہ سناتے ہیں۔

آہ! یہ آٹھ دن کے اندر کیا ہوگیا؟ اس وقت وہ مقدس شیخ جس کے پیچھے ایک

جمعہ کی نماز کا پڑھ لینا خدام کی حاضری کا مقصدِ اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، عین خطبہ و نماز کے وقت سہ دری میں چادر اوڑھے قبلے کی جانب منہ کیے، چت لیٹے، میٹھی نیند پڑے سوتے ہیں۔ غلام منتظرین مگر اِنتظار بے سود۔ عشاق کی مشتاق نگاہیں کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہی ہیں مگر تلاش بے فائدہ۔

آہ! یہ مقدس مجمع جس وقت اپنی جان سے زیادہ عزیز شیخ کی جگہ کسی دُوسرے شخص کو ممبر کا خطیب اور نماز کا پیش اِمام بنا دیکھیں گے تو کیا کچھ نہ بلبلائیں اور چیخ دہاڑ مچائیں گے؟ مگر نہیں! کچھ بھی نہیں ہوا۔ باوجودے کہ نمازیوں کی کثرت کے باعث اِردگرد کے مکانات کی چھتوں تک پر جگہ نہ ملی، اور اِدھر اُدھر کے راستے اور رہ گزر تک میں آدمی بھر گئے۔ اُس اطمینان اور لذّت کے ساتھ خطبہ و نماز سے فراغت ہوئی، جو دوبارہ گنگوہ میں بھی نصیب نہ ہوئی۔ حضرتؒ کے خادمِ خاص مولوی محمد یحییٰ صاحب نے خطبہ پڑھا، اور بجز اس کے کہ عام طور پر خطیب و سامع کے چوٹ کھائے ہوئے دِلوں کے غبار متواتر آنسوؤں کے ذریعے سے برابر فرو ہوتے رہے اور خطیب کو زیادہ حالت بگڑنے کی وجہ سے صرف ایک منٹ کے لیے اپنی آواز کا روکنا اور گریہ کو ضبط کرنا پڑا، کوئی حرکت بھی خلافِ شرع صادر نہ ہونے پائی۔

ہاں! اے دُنیا کے رہنے والو! اللہ کے واسطے بتاؤ کہ کسی شیخ نے اپنے متوسلین کو اِس زمانے میں ایسا متبعِ شریعت بنایا ہے کہ جس کا ادنا سے ادنا مرید پر یہ اثر نمایاں ہو کہ ایسے قیامت خیز سماں پر بھی نوحہ و بین یا حدِ شرع سے بڑھا ہوا گریہ و بکا نہ ہونے پایا ہو؟

شیخ کی تربیت کا اثر:

یہ ہے وہ شیخ کا تصرف جس کی قطبیت کا دعویٰ ہے اور جس کو اِنتقالِ جسمانی

سے صدمہ نہیں پہنچتا، اور یہ ہے اِتباعِ شریعت کا کمال اور تکمیل کا اثر جس کی نظیر میرے دیکھنے میں نہیں آئی۔ دِینی تعلیم کا اعلیٰ اثر اور تصوّف وسلوک کا مقصود بالذّات ثمرہ ایسا عام تھا جو صرف ایک مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والوں کو بھی حاصل تھا۔ اگر یہ کوئی خوبی کی بات ہے تو اس کو حضرتؒ کی کرامت سمجھو، جو بعد وصال اِتباعِ سنت کے فیضانِ خداوندی ہونے کی تائید میں صادر ہوئی۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ !

تاریخِ وفات:

الغرض! جمعہ کے روز ساڑھے بارہ بجے کے بعد بہ اختلافِ رُویت ۸ یا ۹/ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱/اگست ۱۹۰۵ء بہ عمر اٹھتر سال سات ماہ تین یوم حضرت مولاناؒ نے اس عالمِ فانی سے رحلت فرمائی۔ آفتابِ علم وہدایت چھپ گیا۔ مہتابِ ورع وامانت غروب ہوگیا۔ اِس زمانے کے بخاری ومسلم اور اس وقت کے بیہقی وحاکم نے اِنتقال کیا۔ جنیدِ وقت، شبلیٔ زماں، بایزیدِ عصر، حافیٔ دوراں کوچ فرماگئے۔ دُنیا کیوں نہ تاریک ہوجائے؟ اُس کا عالم تاب آفتاب نظروں سے غائب ہوگیا۔ باغِ علم کیوں نہ سوکھ جائے؟ اُس کا چشمۂ رواں زمین میں اُتر گیا۔ ہم خدام کو جو کچھ صدمہ ہے اُس کا اندازہ ہمارے دِل سے پوچھو! حضرت خاتم المحدثین - سیّد المفسرین - انیس العارفین - تاج السالکین - حجۃ الخلف - بقیۃ السلف - مرجع انام - ماوائے خواص وعوام - سیّدنا ومرشدنا الحافظ الحاج حضرت شیخ المشائخ المولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ واصل بہ حق ہوگئے۔ وہ ساقیٔ علوم ومعرفت جن کی ایک نظر نے ہزاروں کو سیراب کردیا، جس نے جدا جدا شریعت وطریقت کی سبیلیں لگارکھی تھیں، دُنیا سے تشریف لے گئے۔ وہ فدائے سنتِ نبویہ مرشد جنہوں نے بدعاتِ مخترعہ کی

تردید اور بطحائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ مرضیہ کی تائید میں سیکڑوں گالیاں شربت کے گھونٹ کی طرح پی لیں، اور پیارے عربی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اِحیا میں مخلوق کی ایذا رسانی پر شکریہ ادا کیا، اِنتقال فرما گئے۔

ہاں! حضرت مولاناؒ کا وصال ایک شخص کا اِنتقال نہیں ہے بلکہ ایک عالم کی موت ہے۔ وَإِنَّ مَوْتَ الْعَالِمِ لَمَوْتُ الْعَالَمِ!

تجہیز و تکفین اور خدام کا مشغلہ:

جمعہ کی نماز کے بعد اِدھر غسل اور تجہیز و تکفین کی تیاری ہوئی اور اُدھر جاں نثار خدام نے ایصالِ ثواب کے لیے تلاوتِ قرآن شریف شروع کردی۔ دو گھنٹے کے اندر اندر سات ختم تو کلام اللہ شریف کے ہوئے، اور اِستغفار و دُرود یا کلمہ و دیگر اَذکار کا شمار نہیں۔ اِس لیے کہ اکثر مجمع کے ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر اَذکارِ مسنونہ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ آنکھیں اپنا کام کر رہی تھیں، ہاتھ اپنے کام میں مشغول تھے، زبان کو اَپنا مشغلہ تھا اور دِل اپنے کام میں مصرف تھا۔ یہ تکفین سے پہلے پہلے اُس شیخ کے لیے ایصال کی حالت تھی، جس کو کوتاہ نظر ملانوں نے مروّجہ فاتحۂ مبتدعہ کی ممانعت کے باعث طعن تشنیع کرتے وقت: ''مر گئے مردُود، نہ فاتحہ نہ دُرود'' کا مورد بنایا تھا۔ کہاں ہیں اللہ کی منصب بارگاہ میں اس سخت بہتان کے باندھنے والے مجرم اور جواب دہ مسلمان؟ ذرا مقابلہ کریں کہ رسم کی پابندی کرنے والے اصحاب کو دفن سے پہلے کتنا ثواب پہنچایا گیا ہے؟ تم کو قسم ہے خدا کی! اگر گنگوہی سلطنت کی رعایا کے اپنے بادشاہ کی نذر کرنے والے دایمی اور مخفی تحایف کا آپ کو علم نہیں ہے تو اس ظاہری ایصالِ مسنون میں بالاَنصاف بلکہ بالاَعشار ہی موازنہ کر دِکھائے؟

آخری دیدار:

تجہیز و تکفین سے پہلے حضرتؒ کے خاص قلم کا لکھا ہوا وہ وصیت نامہ نکال کر موجودہ مجمع میں سنایا گیا، جس کے بے بہا الفاظ اور ضروری اُمور کے ظاہر کرنے والے فقرے اِس مضمون کے خاتمے پر آپ کی نظر سے گزریں گے۔ اِس کے بعد خواص خدام نے اُس سہ دری میں حضرتؒ کو غسل دیا جس جگہ مولانا کی چارپائی بچھا کرتی تھی، اور کفن دے کر صحن خانقاہ میں جنازہ رکھا گیا، تاکہ مخلوق کو عام زیارت کرادی جائے۔

اللہ اللہ! اُس وقت کا ہجوم و اژدحام اور بے تابانہ جمال جہاں آرا کی زیارت کے شوق میں ایک کا دُوسرے پر گرنا کچھ عجیب از خود رفتگی و شورش پیدا کر چلا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ زیارت کو آخری نظارہ سمجھ لیا گیا تھا۔ اس بے تابی کے عالم میں شمع پر گرنے والے پروانوں کو کون روک سکتا اور محبوب کے قدموں پر گرنے والے عشاق کو کون تھام سکتا تھا؟ اِس حالت کو کن الفاظ میں ادا کروں کہ آپ سمجھ جائیں؟ نہیں، خدا کی قسم! اصلی حالت کا نقشہ قلم سے کھینچ نہیں سکتا۔ باوجود روک تھام اور ٹھہرو ٹھہرو کی صداؤں کے، جس وقت مجمع ٹوٹا تو یقین ہولیا تھا کہ چارپائی ٹوٹ جائے گی اور بچے بوڑھے دب کر مر جائیں، اور پس کر مسل جائیں گے، اس لیے پوٹ باندھے بغیر چادر رُخِ اَنور پر ڈال دی گئی اور نہایت مستعدی کے ساتھ جنازہ اُٹھالیا گیا۔

خانقاہ قدوسی خالی ہوگئی:

ہاں مجھے خوب یاد ہے اور عمر بھر یاد رہے گا، جس وقت وہ مقدس خانقاہ جس میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے سولہ سال قیام فرمایا تھا، اور

اب کئی صدی کے بعد اُس کو اُسی طرح آباد ہونا نصیب ہوا تھا، خالی ہوئی ہے۔ اُس وقت در و دِیوار پر اُداسی چھا رہی تھی۔ وہ خانقاہ جس میں حضرتؒ چالیس سال سے متمکن تھے اور اِدھر حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ قایم تھا، اور اُدھر طالبِ حق ذاکر شاغل اہلِ حال کی چہل پہل، دن کو کسی باغ کی بہار کا اِظہار تھا اور شب کو کسی گلستان کی رونق کا فکر و دھیان، کیسی دم کے دم میں بے رونق ہوگئی۔ جہاں ہر وقت ذِکر کی آوازیں کانوں میں پڑ کر سوئے ہوؤں کو بے دار کرتی رہتی تھیں، آج کیوں ویران ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ وہ دِینی پادشاہ جن کی زیارت کو مشرق و مغرب سے خلقت کھنچی چلی آتی تھی، وہ قطبِ وقت جس کی حرکت زمین کی حرکت تھی، آج خانۂ کعبہ کے اندرونی غلاف کے مقدس کپڑے کا قمیص پہنے بالکل سپید، صاف شفاف، متوسط درجے کے پارچے کا کفن لپیٹے اپنے خوش نصیب غلاموں کے کاندھوں پر سوار کسی بڑے سفر کے لیے روانہ ہولیے ہیں۔

آہ! کیا جگر اندوز شعر تھا جو اُس وقت ایک صاحبِ حال خادم کی زبان سے نکلا: ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بھر تماشا مے روی

مبتدعین سے چند سوالات:

جو بات آنکھ سے دیکھنے کو لایق ہو اُس کو زبان کیوں کر بیان کرے؟ اس لیے میں اس پر اِکتفا کرتا ہوں کہ خلقت کی ہجوم کے باعث جس عجیب کیفیت سے جنازہ قبرستان تک پہنچا ہے اُس کو آنکھیں بھی نہیں بلکہ دِل جانتا ہے۔ راستے میں اور خاص قبرستان میں مشتاقانِ جمال کو بہ اطمینان کئی بار زیارت کرائی گئی، کیوں کہ اسی ضرورت کے لیے پوٹ کی گرہ باندھی نہیں گئی تھی۔ اُس وقت

کے حاضر آنکھوں والوں سے قسم دے کر پوچھ لو کہ کیا عظمت وشان نظر آئی؟ اور شانِ محبوبیت میں جنازے پر کیا کیا ترقیاں ظاہر ہوئیں؟

اس قدر مجمع کہ جنازے تک پہنچنا دُشوار ہو، کہاں کہاں دیکھا؟

اور یہ شوق واِشتیاق کہ حملِ جنازہ کی جگہ چادر ہی کو ہاتھ لگ جائے تو غنیمت سمجھا جائے، کس کس جگہ نظر آیا؟

مخلوق کا خود بخود ذِکرِ الٰہی شروع کر دینا اور ہر چھوٹے بڑے کی زبان سے کلمے کا بلا اِختیار صدور اور صاحبِ دِلوں کا اسمِ ذات اور نفی واِثبات کی باقاعدہ ضربیں، اس بے انتہا سراسیمگی میں کسی شرعی ضرورت کے اندر ذرّہ برابر کمی کا نہ ہونا، کس کے جنازے میں دیکھا یا سُنا ہے؟

اللہ! اللہ! ان چند گھنٹوں میں یہ پانچ چھ ہزار کا مجمع خدا جانے کہاں سے آ گیا۔ عورتیں مکانات کی چھتوں اور رہ گزر پر واقع ہونے والے ٹیلے پر کیوں مجتمع ہو گئیں؟

بچوں اور ناسمجھ کو کون پر کیا رنج ہے کہ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں؟

آبادی کے ہنود تک کے چہروں کی رونق اُڑ گئی۔ عید گاہ کے قریب کھلے میدان میں جنازہ رکھا گیا اور آدھ گھنٹے سے زیادہ دیر تک آنے والوں کا تار نہ ٹوٹا۔ رُومال تھے کہ ہلتے نظر آ رہے تھے، اور ''ذرا صبر کرنا!''، ''ذرا ٹھہرنا!'' کی صدائیں جنگل کے درختوں سے ٹکراتی ہوئی کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

نمازِ جنازہ اور اس کا امام:

آخر جب زیادہ توقف مناسب نہ سمجھا تو حضرت مولانا المولوی محمود حسن صاحب مدرّسِ اوّل مدرسۂ اسلامیہ دیوبند کو آواز دِی گئی اور مولانا نے اپنے ہی

نہیں بلکہ عالم کے مرشد شیخ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

نمازِ جنازہ کے بعد مجمع نے وہیں نمازِ عصر ادا کی، اور چوں کہ مسنون لحد کی تیاری میں زمین کے سخت ہونے کی وجہ سے دیر تھی، اس لیے جنازہ رکھ دیا گیا اور خدام گرد آ کر بیٹھ گئے۔ حفاظ نے پھر تلاوتِ کلام مجید شروع کر دی۔ ذاکر شاغل خدام اپنے پاک مشغلے میں لگ گئے، اور باقی متوسلین کو جو کچھ بھی یاد تھا اُس کے پڑھنے اور ثواب پہنچانے میں مشغول ہو گئے۔ اِدھر آفتابِ عالم کے غروب کی تیاری اور شام کا سہانا وقت، اُدھر ماہ تابِ ہدایت کے نورانی چہرے کے لحد میں مستور ہونے کا آنے والا اسماں اور دفن کے لیے قبر کی تیاری میں سرگرمی، اب آپ ہی بتائیں کہ کیوں کر قلم کی تَسطِیر (سطر بندی) سے سمجھ میں آ سکتا ہے؟

تدفین:

خلاصہ یہ کہ بعد نمازِ مغرب خزانۂ معرفت واَسرارِ الٰہی اور مخزنِ شریعت وطریقت کو اپنے ہاتھوں زمین کے سپرد کر کے واپس آئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۝ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۝ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ۝

مولوی احمد رضا خان صاحب کی خوشی پر افسوس:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ تھے وہ تھے، مگر افسوس! مخلوق نے قدر نہ جانی۔ سیکڑوں کو تو وصال پر معلوم ہوا کہ حضرت کیا چیز تھے؟ سچ ہے: ''قدرِ نعمت بعدِ زوال''۔ اب اگر کوئی کفِ افسوس نہ ملے تو کیا اور خوشی کرے؟ تو کیا ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا''۔ اپنے آپ کو عمر بھر چھپانے والے اور باوجود اُستاذ العلماء ہونے کے ادنا طالبِ علم سے کم تر جاننے والے شیخ کے لیے یہ بھی من جانب اللہ اِظہار کی ایک صورت تھی، جو بلا طلب وخواہش اُس وقت ظاہر

ہوئی جس کی حسن وخوبی کا ہر مسلمان متمنی ہے، اور کچھ خبر نہیں کہ اپنا یہ آخری سماں کس انداز پر ہونے والا ہے؟

مجھے بہت ہی زیادہ افسوس ہوا جب میں نے سُنا کہ مولوی احمد رضا صاحب بریلوی نے اِس وفات پر خوشی منائی کہ جس پر شجر وحجر کو رونا آیا، اور آسمان وزمین کو بُکا ہوئی، مگر کیا ہوا؟ آخر اُن کے لیے بھی یہ وقت ضرور آنے والا ہے۔ آخر کوئی اُس حالت کا دیکھنے والا بھی اپنا وبے گانہ موجود ہوگا، وہ دیکھے گا۔ ورنہ عدالت العالیہ اور شاہنشاہ احکم الحاکمین کے بڑے دربار میں تو جملہ اَوّلین وآخرین کو سارا تماشا دیکھنے کا کافی وقت اور پورا موقع ملے گا۔ یہ وہ حالت تھی جس کو کئی ہزار مخلوق نے دیکھا ہے، اور یہ موت وہ موت تھی جس پر اِسلام کے کسی فرقے کو بھی زبان ہلانے کا موقع نہ مل سکا۔

وجہِ تالیف حالاتِ وفات:

طبیعت کا اِضمحلال اس جاں کاہ حادثے کے لکھنے سے قلم روکتا رہا، اور اِسی حالت میں دو ماہ گزر گئے مگر اَحباب کے بدریافت حالاتِ وصال پہنچنے والے خطوط نے مجبور کیا کہ میں تحریر شایع کردوں۔ میرے مہربان دوست منشی نظام خاں صاحب سابق ملازم پلٹن نمبر ۶، اِس تحریر کے زیادہ محرّک وساعی ہوئے۔ اللہ اُن کو جزائے خیر دے، اُنہوں نے مجھ سے یہ کام لے لیا۔

آہ! وہ دُربار دَربار جہاں حاضر ہوکر توکل وقناعت، صبر وریاضت، زُہد وطہارت، صدق وامانت، تقویٰ ودیانت، خلق ومروّت، اِستقلال واِستقامت، اِستغنا واہلِ دُنیا سے نفرت، مہمان نوازی وسخاوت، دریادِلی وشجاعت، غرض مقدس مذہبِ اسلام کی ہر محمود خصلت کا سبق عملی صورت میں پڑھایا جاتا تھا، آج خالی نظر آتا ہے۔ وہ موردِ تجلیاتِ الٰہیہ اور مہبطِ فیوض غیر متناہیہ جس میں جلال

وجمال کے نرالے رنگ جدا جدا نظر آتے تھے، آج مقفل دِکھائی دیتا ہے۔ اولیا کا کمال خرقِ عادات اور اُمورِ عجیبہ کا اِظہار نہیں ہے، اور اگر........ یہ خوارِق بھی جن کو عوام کرامت سمجھتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سیکڑوں صادر ہوئے، مگر اِیمان سے پوچھو تو حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز کا بڑا کمال جس میں جفاکش جوگی اور ریاضت شعار کفار کی شرکت کیا معنیٰ؟ عام اہلِ اسلام بھی شریک نہیں ہوسکتے۔ اِتباعِ سنتِ محمدیہ اور پیرویٔ شریعتِ نبویہ پر وہ اِستقامت واِستقلال ہے، جس کی نظیر بلادِ ہند ہی میں نہیں بلکہ سطحِ زمین پر کسی خطے میں نہ نظر آئی، نہ خبر سنی گئی۔ مجھے فخر ہے اور یہ فخر بہ طور ادائے شکرِ خداوندی کے ہے کہ مجھ جیسے گناہ گار کو حق تعالیٰ شانہٗ نے وہ دامن پکڑوایا جس سے ہزار ہا مسلمان محروم رہے، اور اگر اِنصاف کیا جائے تو یہ محرومی کوئی معمولی محرومی نہیں ہے۔ ہاں! حق تعالیٰ حضرتؒ کے خلفا کی عمروں میں برکت عطا فرمائے اور مدارج میں ترقی، خصوصاً اُس سدابہار گلستانِ شریعت اور ہرے بھرے نخلستانِ طریقت کے بارآور اَشجار میں ممتاز درختوں یعنی حضرت مولانا المولوی خلیل احمد صاحب اَنبیٹھوی - مدرّسِ اوّل مدرسۂ مظاہر العلوم سہارن پور، حضرت مولانا المولوی محمود حسن صاحب دیوبندی - مدرّسِ اوّل مدرسۂ اسلامیہ دیوبند اور حضرت مولانا المولوی عبدالرحیم صاحب رائے پوری - اَدام اللہ فیوضہم - کی ستودہ صفات ذَوات کو ہم ناکارہ غلاموں کے سروں پر قایم ودایم رکھے۔ اگر رُشد وہدایت کے بھوکے پیاسوں کی سیری ہوسکتی ہے تو ان عالی سرکاروں میں ہوسکتی ہے۔

تسلی اور صبر کی تلقین:

میرے پیارے دِینی بھائیو! حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے غلامو، تابع دارو! اور گنگوہی سرکار سے نفع اُٹھانے والو! متبعِ شریعت مسلمانو! صبر کرو صبر کرو۔

تمہارے رُوحانی باپ کی دُنیاوی مفارقت درحقیقت کوئی معمولی صدمہ نہیں، مگر اَجر بھی تو صدمے ہی کی مقدار پر کم وبیش ہوتا ہے۔ تم مجھ سے واقف ہو یا ناواقف، روشناس ہو یا نہ ہو، مگر بہرحال محشر کی ہول ناک جگہ میں ایک شیخ کا دامن پکڑنے والے ہو۔ اس وقت اس مضبوط علاقے کے دھیان میں میری تم سب کے ساتھ غائبانہ محبت یہ جوش دِلا رہی ہے کہ اگر آمنا سامنا ہوتو تمہاری وہ آنکھیں چوم لوں جنہوں نے حضرتؒ کو دیکھا تھا، اور وہ ہاتھ آنکھوں سے لگالوں جنہوں نے وہ مقدس ہاتھ چھوئے تھے۔ تمہیں گوارا ہو یا ناگوار، حضرتؒ کے بعد اَب تمہاری بھی قدر ہوتی ہے۔ خود بخود تم سے اُنسیت پیدا ہوتی ہے۔ میں تو تم کو اپنے حقیقی بھائی سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ خدا کرے یہ میرے الفاظ ملمع کاری وتصنع یا دُنیاوی مال ودولت کی حرص وطمع پر محمول نہ ہوں۔ ہاں! میں دِینی اُخوّت کی بناپر تم سب سے ظاہر کرتا ہوں کہ تمہارے قطب الارشاد شیخ کا باطنی فیض ختم نہیں ہوا۔ اگر توفیق ہوتو مقدس مزار پر حاضر ہوکر آنکھوں سے دیکھ لو۔ نیز ظاہری سلسلۂ تعلیم وتکمیل میں بھی حبہ برابر کمی نہیں، اس لیے کہ حضرتؒ کے خلفا پورب وپچھّم، ہند وحجاز، پنجاب وبنگال، اودھ وممالک مغربی غرض ہر جگہ پھیلے ہوئے مخلوق کو مستفیض کررہے ہیں، اور اَب وہ بڑے بڑے خلفا جو حضرتؒ کے سامنے اِس طرح پوشیدہ تھے جس طرح کواکب قمر کے سامنے، وہ بھی اُس فرضِ منصبی کے ادا کرنے میں جس کے حامل بنائے گئے ہیں، اپنا اِخفا وگریز زیادہ پسند نہ کریں گے۔ خصوصاً حضرتؒ کے لاڈلے اور چہیتے رُوحانی بیٹے حضرت مولانا المولوی خلیل احمد صاحب مد اللہ ظلہٗ اور حضرت مولانا المولوی محمود حسن صاحب ادام اللہ فیضہ!

خاتمہ:

اے میرے معزّز دِینی بھائیو! لو میں اب تم سے رُخصت ہوتا ہوں۔ اپنے دِل کا جوش ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں نکال چکا۔ میں اِن شاء اللہ تم کو نہ بھولوں گا۔ خدا کا واسطہ اور خدا کے رسول کا واسطہ تم بھی مجھے نہ بھولنا۔ اگر اپنے شیخ کے ساتھ تمہیں محبت ہے تو مجھے بھی اُس در کا کتا اور کفش بردار غلام سمجھ کر اپنی دُعا کا محتاج اور بھک منگا فقیر سمجھنا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے لیے دُعائے خاتمہ بالخیر سے بھی بخل ہو۔ میں نا کارہ ہوں، مگر گنگوہی دربار کا غلام کہلاتا ہوں، اِس رشتے سے تمہارا بھائی ہوا۔ کیا بھائی کے کسی قابل بنا دینے کی جانب توجہ نہ کرنا بھائی کی غیرت ومحبت تقاضا کرسکتی ہے؟ خدا مجھے اور تمہیں سب کو اِیمان سے اُٹھائے اور پیارے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی میں محشور فرمائے۔ آمین یا رَبّ العالمین!

ضمیمہ۔ ۳

فخر المحد ثین
حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی
وصیت

حامدًا ومصلّیًا! یہ وصیت عام ہے، سب دیکھیں اور سُنائیں اور عمل کریں۔ اپنی اولاد اور زوجہ اور سب دوستوں کو بہ تاکید وصیت کرتا ہوں کہ

- اِتباعِ سنت کو بہت ضروری جان کر شرع کے موافق عمل کریں۔ تھوڑی مخالفت کو بہت سخت دُشمن اپنا جانیں۔
- اور رُسومِ دُنیا کو سرسری جان کر کرنا نہایت خرابی کی بات ہے۔
- اور لذّت کھانے اور کپڑے کی قید نہایت خرابی ڈالنے والی دِین و دُنیا کی ہے، اُس سے بہت اِجتناب کریں۔
- اپنے مقدور سے بڑھ کر کام کرنا مآلِ کار ذلیل ہونا ہے۔ اِس کی رُسوائی دِین و دُنیا میں اُٹھانی ہوتی ہے۔
- بدمزاج و کج خلقی سخت نامرضی حق تعالیٰ کی ہے۔ دُنیا میں ایسا آدمی خوار رہتا ہے اور آخرت میں نہایت ذِلت اُٹھاتا ہے۔ نرمی سب کے ساتھ لازم ہے۔
- اور بُرا کام قلیل بھی بُرا ہے اور اِطاعت و اچھا کام اگرچہ تھوڑا ہو بہت بڑا رفیق ہے۔

- تکلّفات شادی وغمی کے بدعت سے خالی نہیں ہیں، اُس کو سرسری نہ جانیں۔
- طعن و تشنیع خلق اور برادری کے سبب سے اپنے مقدور سے زیادہ کام کرنا یا خلافِ شرعی یا بدعت کو کرنا عقل کی بات نہیں۔ دُنیا و دِین میں اِس کا خمیازہ بُرا ہے۔
- اِسراف کی مذمت اور بُرائی شریعت میں سخت آئی ہے کہ شیطان کا بھائی اُس کو قرآن میں فرمایا ہے۔
- اگر میرا اِنتقال ہو جاے تو حسبِ مقدور ثواب پہنچائیں، اندازے سے زیادہ ہرگز نہ کریں، نہ کوئی تکلفِ غیر مشروع کریں، جو کچھ ہو موافق سنّت کے ہو۔ باہم اِتفاق سلوک سے رہیں۔
- میرے ذمے کسی کا ایک پیسہ تک قرض نہیں، اِس کا کچھ فکر نہ کریں۔ ترکۂ رام پور جو فروخت ہوا سب کا حصہ دِیا، یا صاحبِ حق نے معاف کیا، مگر ہمشیر کلاں نے نہیں لیا اور اُن کی رضامندی سے وہ رپیہ ہمارے پاس خرچ ہوا ہے، اور ترکۂ گنگوہ جو جدّی ہے اس میں اَمۃ الحق کا حصہ نہیں، کیوں کہ وہ دادا صاحب مرحوم نے ہمارے نام پر ہبہ کیا تھا، اُس میں فقط ہم ہر سہ کا حصہ ہے۔ دو دو سہام (حصے) بندے اور بھائی صاحب کے اور ایک حصہ ہمشیر صاحبہ کا، اور جو ترکہ والد مرحوم کی خرید ہے اُس میں چونسٹھ سہام (حصے) میں سے سات سہام (حصے) اَمۃ الحق کے ہیں اور باقی کے پانچ حصے ہو کر دو دو ہمارے ہر دو برادر کے اور ایک حصہ ہمشیر صاحبہ کا ہے۔ جب اہلِ حق طلب کریں دے دیں، اور کتب جو میرے پاس ہیں اُن کی فہرس لکھی ہوئی رکھی ہے، سب کتب زرِ خرید اپنے کا نام لکھا ہے، مگر بعض رسائل کا نام نہیں لکھا گیا، اور وقفی کتابیں اور مستعار اور ترکہ والد سب کا نام لکھ دیا ہے۔ سب مستعار کتب حوالۂ مالک کر دیں، اور وقفی کو اگر اِحتیاط سے

رکھ سکیں تو رکھیں ورنہ کسی مدرسہ دِینی میں دے دیں، اور ترکے کی کتابوں کو رکھیں مگر جو حصہ لے تو حسبِ فرایض دے دیں۔ فقط اِس سب پر عمل درآمد غور سے کریں۔ آیندہ مختار ہیں، اپنے کیے کو آپ دیکھیں گے۔ یہ عاجز بَری الذمہ ہولیا۔ والحمدللہ رَبّ العالمین!

• الماری کلاں حجرے میں سب کتب وقفی ہیں، اُس میں کوئی کتاب نہ مملوک بندے کی ہے اور نہ مستعار کی۔ بعد موتِ بندہ جہاں مناسب ہو یہ کتب رکھی جائیں، اور جو حافظ مسعود احمد کو درس کا خیال ہو تو قدرِ حاجت خود بھی رکھیں، اور یہ الماری مِلک بندے کی ہے وقف نہیں، اور دُوسری الماری خورد تُن کی لکڑی کی، اُس میں سب کتب مِلک بندے کی ہیں، مگر بعض کتاب جو مستعار ہیں اُس پر نام مالک کا لکھا ہے، وہ مالک کو دی جائے۔ عالمگیریہ: حافظ محمد اِبراہیم، شرح مسلم: منشی فخر الدین کی، شرح شامی: مولوی ابوالنصر، شرح فقہِ اکبر: طیب مرحوم کی اور شامی کا تکملہ خود مِلک بندے کی ہے، اور جو کتاب ترکہ والد مرحوم کی ہے اُس پر نام والد کا لکھا ہوا ہے اور مملوک پر نام بندے کا، اور خارج الماری سے جو کتب ہیں بعض وقف، بعض مستعار، بعض مملوک۔ اُن سب پر نامِ مالک لکھا ہے۔ حسب اُس کے عمل کریں، اور مولوی عبدالکریم کی کتب خارجِ الماری، الماری نما صندوق میں رکھی ہیں، وہ اُنہوں نے ہبہ بہ نامِ بندہ کر دیا ہے، اور وقف خود وقف ہیں، اور حجرے کا اسباب سب کا سب مِلکِ بندہ ہے، سوائے ایک دو عدد رضائی کے کہ وہ مہمانوں کے واسطے رکھی ہیں، وہ صدقہ کر دی جائیں، مگر گھڑی دُھوپ جامع مسجد کی ہے، اور روپیہ جو کچھ قلم دان والماری میں ہے جس پر کچھ نشان لکھا ہے وہ اُس کا ہے، مسجد کا یا کسی کا، اور جس پر کچھ تحریر نہیں وہ مِلکِ بندہ ہے، اور کاغذاتِ قرض وغیرہ قلم دان میں ہیں، اُن سے سب حال واضح ہو جائے گا،

موافق اس کے عمل کریں۔ ہر شے اپنے مصرف پر اور مالک کو ملے، اِس میں فردگزاشت نہ ہو۔

- گھر کی الماری میں سب کتب مِلکِ بندہ ہیں یا ترکہ والد کے، اور روپیہ سب اپنا ہے، سوائے اُس کے کہ اُس پر کسی کا نام لکھا ہو وہ اُس کا ہے۔ امانت مالک کو دے دیں، باقی کے مختار ہیں۔ میرے ذمے کسی کا قرض نہیں، جو میرا قرض ہے اُس کی فرد قلم دان میں ہے، دیکھ کر وصول کرلیں۔ اگر دو چار آنے دانے گھاس کے عاشق یا کوئی خادم بتائے، وہ دے دیں، شاید سہو سے رہ گیا ہو؟ ورنہ قرض مجھ پر نہیں ہوتا۔ فقط!

عن بعض الصالحین عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ
کے بعض حالات کا تذکرہ

ملقب بہ

ذکر محمود

یادگار قلم

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

ناشر
مکتبہ رشیدیہ
بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

ذِکرِ محمود

ذِکرِ محمودؒ(۱) از محمد شد حسن
حامدِ حق محسنِ اہلِ زمن

خطبہ:

بعد حمد وصلوٰۃ مجھ سے میرے بعض اعزّہ(۲) نے فرمایش کی کہ کچھ مختصر تذکرہ اِمام العلماء، مقدامُ العرفاء، اُستاذی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کا لکھ دُوں۔ میں نے کافی واقعات وحالات پر محیط نہ ہونے کا عذر کیا۔ عزیز موصوف نے کہا: جیسا ''یادِ یاراں'' میں حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے بعض متفرق ومختصر واقعات بہت ہی قلیل مقدار میں لکھ دیئے ہیں اسی انداز پر لکھ دیا جائے، پھر ہم لوگ اُس کے ساتھ خود منضم کرلیں گے۔ چوں کہ اس مقدار اور اس طرز میں لکھنے سے کوئی عذر نہ تھا، اور مقبولین کے تذکرے کا

---

(۱) یعنی ذِکر(مولانا) محمود(حسن) کا، سیّدالعالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے (کہ مولاناؒ کو مثل جمیع مقبولین کے حضور سے حاصل ہے) حسن ہوگیا، اور مصرعۂ ثانیہ میں حامد اور محسن مع اپنے قیود کی صفتیں ہیں، محمود واقع مصرعۂ اُولیٰ کی اور معنی ظاہر ہیں، اور دونوں مصرعے مولاناؒ کے نام کی تصریح اور آپ کے تینوں بھائیوں کے ناموں کی طرف اِشارے پر مشتمل ہیں۔(اشرف)

(۲) المراد بہ ابن اختی المولوی ظفر احمد جعلہ اللہ کما یحب ویرضی۔(اشرف)

موجبِ برکت وسعادت ہونا معلوم ومسلّم ہے، اس لیے بہ نامِ خدا یہ چند سطریں لکھتا ہوں اور اس کا لقب ''ذِکرِ محمود'' تجویز کرتا ہوں، جس کی دونوں ترکیبیں ہوسکتی ہیں، خواہ موصوف وصفت کہیے، خواہ مضاف ومضاف الیہ، اور اوّل اَولیٰ ہے مع اشارے کے ثانی کی طرف۔ **واللّٰهُ الْهَادِىْ اِلَى الصَّوَابِ وَهُوَ الْمُيَسِّرُ لِكُلِّ صِعَابٍ!**

اور اس کے اجزا کو مع قیدِ عدد بہ عنوان ''ذِکر'' تعبیر کروں گا۔

اذکار

پہلی زیارت:

ذکر نمبر ۱: سب سے پہلے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت وصحبت سے مشرف ہوا وہ زمانہ تھا جس میں تحصیلِ درسیات کے لیے دیوبند کے مدرسۂ عالیہ میں حاضر ہوا، اور من جملہ اسباقِ مجوّزہ کے مُلّا حسن اور مختصر معانی کا سبق مولاناؒ کے متعلق ہوا۔ یہ زمانہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) کا آخیر تھا، یعنی ذی قعدہ کا مہینہ تھا۔ مولاناؒ اُس وقت مدرّسِ رابع تھے، اور مدرّسِ اوّل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مدرّسِ دوم حضرت مولانا سیّد احمد صاحب اور مدرّسِ سوم حضرت مولانا محمد محمود صاحب تھے، رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً!

حضرت نانوتویؒ کی خدمت:

ذکر نمبر ۲: مولاناؒ اس وقت بالکل جوان تھے اور لباس بہت نفیس پہنتے تھے، اور بندوق سے شکار کا مشغلہ بھی بہ کثرت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا قاسم العلوم قدس سرہٗ بھی دیوبند تشریف فرما تھے، مدرسہ آپ کی سرپرستی میں تھا، درس سے فارغ ہوکر زیادہ وقت حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں صَرف فرماتے تھے۔

تقریر میں سلاست وارتباط:

ذکر نمبر ۳: مولاناؒ کی ذہانت اور فطانت تو خداداد فطری تھی ہی، اس پر شباب کے رنگ نے سونے پر سہاگہ کا کام دے رکھا تھا۔ اس قدر تیزی تھی کہ سبق شروع

ہونے کے وقت جس جگہ نشست ہوتی تھی ختم ہونے تک اس جگہ سے بہت آگے بڑھ آتے تھے، مگر تقریر میں باوجود تیزی وروانی کے سلاست اور اِرتباط اور ترتیب اس درجے تھی کہ مفہوم کتاب کا آئینہ ہوجاتا تھا۔

نفسِ مطلب پر اِکتفا:

ذکر نمبر ۴: عادتِ شریفہ تقریرِ کتاب میں یہ تھی کہ اکثر نفسِ مطلب پر اِکتفا فرماتے تھے، جس کا نتیجہ کتاب کا جلدی نکلنا، کتاب سے طالبِ علم کو کامل مناسبت اور اس سے کامل اِستعداد ہوجانا تھا۔ حسن ووجازت ووضاحتِ تقریر میں مولاناؒ کا ثانی غالباً اب تک بھی ذہن میں نہیں ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ!

اسباق میں کیفیات:

ذکر نمبر ۵: مُتعَسِّفانہ سوال کے مقابلے میں اِلزامی مُسکِت جواب تو ایسا ہوتا تھا کہ طالبِ علم منہ تک کے نقشِ دیوار کی طرح رہ جاتا تھا، اور اکثر ایسے جواب میں ایک لطیف مگر چبھتا ہوا مزاح بھی شامل ہوتا تھا، جو اِنتہا کی تہذیب کے ساتھ نفس کا پورا معالجہ ہوتا تھا۔

ذکر نمبر ۶: مذکورہ اسباق کے سلسلے میں احقر کے اسباق، فراغِ درسیات تک مولاناؒ کی خدمت میں رہے۔ معقولات میں حمد اللہ، میرزاہد رسالہ، میرزاہد مُلا جلال اور حدیث میں متعدّد کتب جن کی تفصیل رسالہ سبع سیارہ میں ہے، اور فقہ میں ہدایہ آخرین تو اس وقت مولاناؒ سے پڑھنا یاد ہے، باقی شاید سوچنے سے یاد آجائے۔

ذکر نمبر ۷: معمول یہ تھا کہ جب طالبِ علم عبارت پڑھ چکتا تو لمبی سے لمبی

عبارت کا نہایت مختصر اور جامع خلاصہ ایسا بیان فرما دیتے کہ پھر طالبِ علم کو اس کی تفصیل کو سمجھ لینا آسان سے زیادہ آسان ہو جاتا۔ گویا اس تفصیل کا اس اِجمال پر منطبق کرنا ہی رہ جاتا ہے، اور مطلب سمجھنے میں ذرّہ برابر گنجلک نہ رہتی۔ یہ بھی من جملہ کمالاتِ خاصہ تھا۔

ذکر نمبر ۸: معمول مذکور نمبر ۷ کی یہ برکت تھی کہ کتابیں اس طرح جلد جلد ختم ہوتی تھیں، جیسے کوئی مشین میں ڈھالتا ہو، حتیٰ کہ ہدایہ آخرین کا ایک معتدبہ حصہ بلاترجمہ ہی نہایت سہولت سے پڑھنا یاد ہے۔

ذکر نمبر ۹: حدیث میں گاہ گاہ تلامذہ کی درخواست پر خود بھی عبارت پڑھتے، جس کی روانی اور مفہم لہجے کا لطف مشاہدے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اور خوبی یہ ہے کہ درمیان درمیان ایسے وقفاتِ لطیفہ بھی ہوتے تھے کہ جس کا دِل چاہے اپنے شبہات وسوالات اطمینان سے حل کر سکے۔ اس حالت کے جوابات میں ایک خاص اِختصار اور اِسکات کی شان ہوتی تھی۔

مناظرہ:

ذکر نمبر ۱۰: احقر کو زمانۂ طالب علمی میں ہر فرقے کے ساتھ مناظرہ کرنے سے ایک خاص دِل چسپی تھی، جیسی اب اس سے اسی درجے نفرت و وحشت بھی ہے۔ دیوبند میں ایک بار عیسائی منادیوں کا ایسا سلسلہ لگا کہ مسلسل یکے بعد دیگرے آتے اور بازار میں تقریریں کرتے۔ احقر سنتے ہی پہنچتا اور گفتگو کرتا۔ ایک بار ایک بڑا پادری جو یورپین تھا، زیادہ مجمع وسامان کے ساتھ آیا اور ایک باغ متصل اسٹیشن میں خیمے نصب کر کے ٹھہرا۔ احقر مع چند طلبا کے وہاں بھی پہنچا اور اس سے گفتگو شروع کی۔ کسی نے حضرت مولاناؒ کو خبر پہنچا دی۔ اس شفقت کی کچھ حد ہے کہ صرف یہ خیال کر کے کہ کم عمر اور ناتجربہ کار ہے، کبھی مرعوب نہ ہو جائے،

خود اس باغ میں تشریف لائے اور مجھ کو ہٹا کر خود گفتگو شروع فرمائی۔ اس نے نام پوچھا، آپ نے فرمایا: ننھا! وہ معمولی آدمی سمجھ کر گفتگو کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ اس گفتگو میں یہ بھی تھا کہ اس نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللّٰہ ہیں۔ مولاناؒ نے اس کی تفسیر پوچھی، تو وہ نہ بتلا سکا۔ اس میں مزاحاً یہ سوال بھی فرمایا کہ کلمے کے یہ اقسام ہیں، پھر ان اقسام کے یہ اقسام ہیں، عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کلمے کی کون (سی) قسم تھے؟ تو وہ منہ دیکھ رہا تھا اور جواب میں پریشان تھا۔ آخر اس کی میم (عورت) نے یہ حالت معلوم کر کے ایک رُقعہ بھیج کر اس کو بلایا اور اس نے جان چھڑا کر چلے جانے کو غنیمت سمجھا۔ ہم سب لوگ خوش بہ خوش مدرسے واپس آئے۔

تصانیف اور ترجمۂ قرآن:

ذکر نمبر ۱۱: اُسی زمانے میں مولاناؒ کو شغلِ تصنیف سے بھی دِل چسپی تھی، چناں چہ "ادلۂ کاملہ" کا جواب جو غیر مقلدین کی طرف سے موسوم بہ "مصباح الادلہ" لکھا گیا تھا، حضرت مولاناؒ نے اس کا جواب لکھا جو مطبوع بھی ہو گیا ہے، جس کا نام "ایضاح الادلہ" ہے۔ پھر مختلف زمانوں میں دُوسرے رسائل بھی لکھے، جن میں دو اس وقت یاد ہیں: ایک "احسن القریٰ" دُوسرا "جہد المقل"۔ جن کی حسن وخوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اور سب سے اَنفع اور اَرفع تصانیف میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے جو اَخیر عمر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں جن فواید ولطائف کا اِلتزام واِہتمام فرمایا گیا ہے ان کی تحقیق وتفصیل اس کے مقدمے میں تحریر فرمائی گئی، جو میرے نزدیک وہ بجائے خود ایک مستقل رسالہ ہے۔ ایسا کہ اگر کوئی خاص صاحبِ علم مجموعہ ترجمے کو بھی نہ دیکھے تو خود اس مقدمے کو تو دیکھ لینا ضرور ہی ہے۔

ذِکرِ تواضع

تواضع وخلوص کی صفت حق تعالیٰ نے ایک خاص ممتاز شان سے عطا فرمائی تھی، جس کے بعضے آثار یہ تھے جو یہاں سے نمبر ۲۲ تک مذکور ہیں۔

ذکر نمبر ۱۲: تلامذہ کے ساتھ اس طرح اِختلاط واِرتباط واِنبساط رکھنا کہ دیکھنے والا کبھی نہ سمجھ سکے کہ یہ اس مجمع کے مخدوم ہیں۔

ذکر نمبر ۱۳: بعضے خدام کے ساتھ جن میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی، مثلاً: مولاناؒ کے کسی اُستاذ یا بزرگ کی اولاد میں سے ہونا، یا عوام مسلمین کے نزدیک معظم ہونا، وَنَحْوِ ذٰلِکَ اُن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اجنبی شخص کو شبہ ہو سکے خادم پر مخدوم ہونے کا۔ جب خدام کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو مساوی یا بڑوں کے ساتھ معاملے کا اسی سے موازنہ کرلیا جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی راحت مقدم ہے:

ذکر نمبر ۱۴: ایک بار اس احقر کے پاس ایک سرفراز نامہ آیا، جس میں القاب میں ''مخدوم ومکرم'' کے الفاظ تھے۔ میں بے حد شرمندہ ہوا اور میں نے عریضے میں اپنی اس خجلت کو ظاہر کر کے درخواست کی کہ ایسے الفاظ تحریر نہ فرمائے جایا کریں۔ اس کے بعد جو والا نامہ آیا پھر اس میں وہی الفاظ۔ آخر میں نے عرض کیا کہ میری درخواست منظور نہ ہونے سے معلوم ہوا کہ حضرت کو اسی میں راحت

ہے، گو مجھ کو کلفت ہو، مگر میں حضرت کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم سمجھتا ہوں، اب جو مرضی ہو اِختیار فرمایا جائے، میں گوارا کروں گا۔

ذکر نمبر ۱۵: کسی سے کسی خدمت کی فرمایش کرنے کی عادت نہ تھی، بلکہ اکثر مہمانوں کے لیے کھانا مکان سے اپنے ہاتھ میں لاتے اور خود کھلاتے۔

للّٰہیت:

ذکر نمبر ۱۶: ایک بار احقر کی درخواست پر مدرسۂ جامع العلوم کان پور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے، اور اَحقر کے بے حد اِصرار پر وعظ فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ جامع مسجد میں وعظ شروع ہوا، جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے، میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا، جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں؟ مولاناؒ کی جوں ہی مولانا علی گڑھیؒ پر نظر پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ بہ وجہ ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے، انہوں نے دُوسرے وقت عرض کیا کہ ''یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا''۔

فرمایا: ''ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اِظہارِ علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے۔''

سبحان اللہ! یہ ہیں حقیقی کمالات!

کسرِ نفسی:

ذکر نمبر ۱۷: ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مراد آباد میں وعظ کی درخواست

کی گئی، بہت کچھ عذر کے بعد منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی:

"فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ"

کے ترجمے کا حاصل "بھاری" لفظ سے فرمایا۔ مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو "محدث" کے لقب سے معروف تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا:

"اَشَدّ کا ترجمہ غلط کیا گیا، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں"۔

تو مولاناؒ بے ساختہ کیا فرماتے ہیں:

"حضرت! مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں، اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انہوں نے مانا نہیں، اب بہت اچھا ہوا حضرت کے اِرشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہوگئی اور بیان سے بچ گیا۔"

حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا کچھ پوچھنا نہیں۔ دانت پیستے تھے کہ یہ کیا لغو حرکت تھی، گو مولاناؒ کے ادب سے کچھ بول نہ سکتے تھے، مگر مولاناؒ نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت سکون کے ساتھ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیازمندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا:

"حضرت! غلطی کی وجہ معلوم ہو جائے تو آیندہ احتیاط رکھوں۔"

انہوں نے کڑک کر فرمایا:

"اَشَدّ کا ترجمہ آپ نے اَثْقَل سے کیا، یہ کہیں منقول نہیں، اَضَرّ سے کرنا چاہیے۔"

مولاناؒ نے فرمایا:

"اگر کہیں منقول ہو تو؟"

انہوں نے کہا:

"کہاں ہے؟"

مولاناؒ نے فرمایا:

''حدیث وحی میں ہے: کسی نے پوچھا: كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ جواب میں اِرشاد ہوا: يَأْتِينِي أَحْيَانًا مِثْلَ سَلْسَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ اور ظاہر ہے کہ یہاں ''اَضَرّ'' کے معنی ممکن نہیں، ''اَثْقَل'' ہی کے معنی صحیح ہو سکتے ہیں''۔

بس یہ سن کران کا تو رنگ فق ہو گیا، مگر مولاناؒ نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا، لیکن ان کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اپنی غلطی کا اِعلان فرمادیں (۱)۔

وذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَلَنِعْمَ مَا قِيلَ:

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دل بری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری اند

حضرت گنگوہیؒ سے اِجازتِ حدیث کی خواہش:

ذکر نمبر ۱۸: یہ بھی بعض ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولاناؒ نے ارشاد فرمایا کہ بارہا حاضری گنگوہ کے وقت خیال ہوا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے حدیث کی اجازت کی درخواست کروں، مگر معاً ہی یہ خیال مانع آ گیا کہ اگر حضرت پوچھ بیٹھیں: ''تجھ کو آتا ہی کیا ہے جو حدیث کی سند مانگتا ہے؟'' تو کیا جواب دُوں گا؟ بس یہ سوچ کر چپ رہ گیا۔ اللہ اکبر! کچھ حد ہے تواضع کی؟

---

(۱) ''ذِکرِ محمود'' مشمولہ ''تذکرۂ شیخ الہندؒ'' میں اس جگہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے جو حاشیہ لکھا ہے وہ یہ ہے: اس ذِکر [۱۷] میں جن بزرگ محدث کی طرف اشارہ ہے وہ رام پور کے مشہور محدث مولانا محمد شاہ رام پوری ہیں، واقعے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''مقالاتِ عثمانی''؛ ج ۲، از مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ص ۳۷-۴۳۴۔ (اعجاز)

نفاست پسندی اور سادگی:

ذکر نمبر ۱۹: جیسے شباب میں لطافتِ مزاج کے سبب نفیس پوشش مرغوب تھی، اب غلبۂ تواضع کے سبب اس قدر سادہ لباس اور جوتا، اور سادی ہی وضع اِختیار فرمائی تھی، جیسے مساکین کی وضع ہوتی ہے۔ وضع سے کوئی شخص یہ گمان نہ کرسکتا تھا کہ آپ کو کسی قسم کا بھی امتیازِ مالی، جاہی، علمی حاصل ہے۔ حال آں کہ ع

آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

اِمامت سے گریز:

ذکر نمبر ۲۰: میں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا کہ آپؒ نے کبھی اِمامت فرمائی ہو۔

ہاں بھائی! یہ عیب تو میرے اندر بھی ہے:

ذکر نمبر ۲۱: میرے سامنے کا قصہ ہے کہ مدرسۂ عالیہ دیو بند میں اہلِ علم کا ایک خاص جلسہ تھا، جس میں اس پر کلام ہو رہا تھا کہ آج کل طلبا اکثر بد اِستعداد کیوں ہوتے ہیں؟ اور سب متفقاً اس کا سبب طلبا کی کوتاہیوں کو بتلا رہے تھے۔ مثلاً: مطالعہ نہ دیکھنا، سمجھ کر نہ پڑھنا، اپنی رائے سے سبق شروع کر دینا، سبق چھوڑ دینا، ومثل ذٰلک!

ایک صاحب جو کسی مدرسے میں مدرّس تھے اور حضرت مولاناؒ کے شاگرد بھی تھے اور طبعاً ذرا دلیر تھے، بے ساختہ بول اُٹھے کہ کیوں حضرات! سب طلبا ہی پر اِلزام ہے، مدرّسین کی کوئی خطا نہیں؟ حضرت مولاناؒ نے فرمایا: ''ہاں بھائی! وہ تم بتلاؤ!'' وہ بولے: کیا یہ مدرّسین کی غلطی نہیں ہے کہ کسی طالبِ علم نے کوئی بات پوچھی، بجائے اس کے کہ شفقت سے اس کا شبہ رفع کریں، جھاڑ کی طرح اس کے پیچھے لگ گئے اور اِلزامی جوابوں سے اس کے سر ہو گئے۔ وہ بے چارہ خوف

زدہ ہوکر چپ رہ گیا اور وہ شبہ جوں کا توں رہ گیا۔ تو اس فن میں کیا اِستعداد ہو؟ تو مولانا ؒ کیا فرماتے ہیں: ’’ہاں بھائی ہاں! سچ کہتے ہو، یہ عیب تو میرے اندر بھی ہے۔‘‘ وہ بے چارے بے حد شرمندہ ہوئے کہ حضرت! واللہ جو میرا یہ مقصود ہو؟ نعوذ باللہ! حضرت کو تھوڑا ہی کہتا ہوں۔ ہنس کر فرمانے لگے: ’’تم نہ کہو، مجھ کو تو معلوم ہے، میں تو کہتا ہوں۔‘‘

کمالِ صبر و برداشت:

ذکر نمبر ۲۲: بعضے درشت و نادرست مزاج طلبا درس میں بہت ہی بے ادبی کے الفاظ کہہ ڈالتے تھے، مگر حضرت مولانا ؒ کو کبھی اس پر تغیر نہیں ہوا۔ اس وقت کوئی خاص قصہ ذہن میں حاضر نہیں۔

مکاتیبِ حضرت مولانا رحمہ اللہ

ذکر نمبر ۲۳: یہ میری کوتاہی ہے یا کم ہمتی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکاتبت (خط وکتابت) کا بہت ہی کم اِتفاق ہوا، اور جو بعض اوقات اس کی نوبت بھی آئی اور اس کا جواب بھی بالالتزام عطا ہوا تو ان کی حفاظت کا کچھ اِلتزام نہیں ہوا۔ اس وقت کل تین والا نامے محفوظ یاد آتے ہیں، ایک تو تفسیر کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے، جو تتمہ جلد رابع فتاویٰ اِمدادیہ: ص ۳۲۶ میں مطبوع ہوگیا ہے(۱)، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے، اور دو معمولی مضمون کے

---

(۱) حضرت تھانویؒ نے جس مکتوب کا ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے:

اَز احقر محمود عفاعنہ

بہ خدمت گرامی مکرمی جناب مولانا مولوی اشرف علی صاحب زید مجدہم ودام شرفہم

تسلیمات وتحیاتِ مسنونہ کے بعد عرض ہے: الزانیہ کے تقدم اور السارقہ کے تأخر کی نسبت چوں کہ بالتصریح حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ سے کوئی بات سنی ہوئی بندے کو یاد نہیں، اس لیے کچھ جواب دینے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اہلِ تفاسیر کے ارشادات جناب کو مجھ سے زاید معلوم ہیں، پھر فرمایئے عرض کروں تو کیا کروں؟

البتہ ملا کی تعریف میں داخل ہونے کی نیت سے یہ عرض ہے کہ سارق اور سارقہ فعل سرقہ میں ہر ایک مستقل ہے۔ ایک کے فعل میں دُوسرے کو دخل نہیں، بہ خلاف فعل زنا کے کہ فعل واحد دونوں کا محتاج ہے، کسی کو مستقل نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے سارق کو مقدم فرمانا تو محل خلجان نہیں ہوسکتا کہ رجال اشرف اور اَقویٰ ہونے کی وجہ سے تقدیم کے مستحق ہیں۔ چناں چہ آیاتِ قرآنی میں یہ تقدیم جابہ جا موجود ہے، حتیٰ کہ صرف رجال پر اکثر مواقع میں اَحکام وخطابات جاری فرمائے جاتے ہیں، اور نساء کا ذِکر تک بھی نہیں فرماتے، تبعاً نساء کو داخل کرنے پر اِکتفا کیا جاتا ہے۔

←

→ البتہ باعثِ خلجان یہ ہے کہ خلاف قاعدہ آیت سورۂ نور میں زانیہ کو مقدم ذکر فرمانے کی کیا وجہ ہو؟ اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ بسا اوقات باعثِ تقدیم بے شک اولویت اور اقدمیت ہوتی ہے، اسی کی وجہ سے رجال کو مستمر اً مقدم کیا جاتا ہے، مگر کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی مصلحت کی رعایت سے ضعیف کو قوی پر مقدم کرنا عین حکمت و بلاغت سمجھا جاتا ہے۔ آیت: مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ میں وصیت کو دَین پر اسی وجہ سے مقدم فرمایا گیا۔ حال آں کہ دَین وصیت سے قوی ہے۔ جب کہ یہ مسلّم ہو چکا کہ تقدیم کبھی بہ وجہ قوت ہوتی ہے اور کبھی بہ وجہ ضعف، تو اَب یہ عرض ہے کہ مانحن فی بین زانیہ کی تقدیم میں دونوں وجہ جاری ہو سکتی ہیں۔ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر چند فعل زِنا گو دونوں پر موقوف ہے، مگر اکثر اوقات یہی ہوتا ہے کہ محرکِ اوّل اس امر میں عورت ہی ہوتی ہے۔ کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے ایسے انداز و حرکات صادر ہوتے ہیں جو رِجال کو باعثِ رغبت و تہیج شوق ہو جاتے ہیں، بدوں (بغیر) اس کے کہ عورت کی طرف سے کسی قسم کی ادنا اعلیٰ تحریک ہو، وقوعِ زِنا نہیں ہوتا، یا ہو تو شاذ و نادر ہو۔ فقط!

زانیہ فرمانا مزنیہ نہ فرمانا بھی اس طرف مشیر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ عورت کو لباسِ زینت و خوش بو کے ساتھ گھر سے نکلنا یا اجانب کے قریب ہونا بھی منع ہوا، بہ خلاف رجال کے کہ ان پر یہ تشدد نہیں فرمایا گیا، اور عورت کے تحرک کے بعد رجال سے ضبط و صبر ہونا شاذ و نادر۔ یہی وجہ ہے کہ مرد کی طلب کو عورت بسا اوقات مسترد کر دیتی ہے، مگر طلب نساء کو رجال سے روکنا نہایت دُشوار اور نادر الوقوع۔ نظر بریں وجوہ نساء اس بارے میں اقویٰ اور اقدم ہیں اور لائق تقدیم۔

حضراتِ مفسرین کے ارشادات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ رجال اس امر میں فاعل و مختار و قادر و نساء منفعل و مجبور حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ تو رجال پر اِکراہ علی الزنا کو معتبر بھی نہیں فرماتے تو عورت کی جانب ضعیف معلوم ہوتی ہے، جس سے ممکن ہے کہ کسی کو اجرائے حد زنا کا جو کہ اشد الحدود ہے نساء پر موجبِ رأفت و درگزر ہو جائے۔ اس لیے نساء کو رجال پر مقدم فرمانا مثل تقدیم وصیۃ علی الدین مطابق حکمت و بلاغت ہو۔

نیز وجہ ثانی کی مؤید ایک وجہ وجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نساء کی نسبت زنا کی ادنا سی تہمت بھی نعوذ باللہ اس قدر موجبِ ننگ و عار ہے کہ اس کا تحمل معمولی آدمیوں سے تو کیا؟ خواص سے بھی سخت دُشوار۔ اب یہ الزام کسی عورت پر لگے اور حاکم کے رُو بہ رو جا کر سارے مراحل طے ہو کر علی الاعلان عورت پر حد زنا کو جاری کیا جائے۔ اللہ اکبر! اس قدر سنگین امر ہے کہ اولیائے مزنیہ تو درکنار تمام خاندان و اہل قبیلہ و اہلِ برادری کو بھی اس کا تحمل مالا یطاق نظر آتا ہے، لا افضح قومی سائر الیوم شاہد بھی موجود ہے، اس لیے عورت پر حدِ زِنا جاری کرنے میں بالیقین سب ہی تساہل کریں گے، بلکہ مانع ہونے کو مستعد ہوں گے، تو اَب اجرائے حد میں ان کو مقدم فرمانا تقدم وصیۃ علی ←

ہیں، ان کو ذیل میں برکت کے لیے نقل کرتا ہوں۔ حضرتؒ کے مذاق تواضع وشفقت پر دلالت کے لیے یہ بھی دو شاہد عدل سے کم نہیں ہیں۔

مکتوب نمبر ۱:

سراپا فضل وکمال شَرَّفَکُمُ اللہُ تَعَالٰی وَجَعَلَکُمْ فَوْقَ کَثِیْرٍ مِّنَ النَّاسِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بارہا آپ کی خیریت معلوم ہونے کا داعیہ پیدا ہوا، اور ایک دو دفعہ بعض آیندگان کی زبانی آپ کی خیرت معلوم بھی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مع جملہ متعلقین خیریت سے رکھے۔ اس وقت ایک صاحب بنگالی مسمّٰی عبدالمجید سے ملاقات ہوئی جو ہندوستان واپس ہورہے ہیں اور جناب کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں، یہ موقع غنیمت معلوم ہوا، اس لیے یہ عریضہ روانہ کرتا ہوں۔ بندہ مع رُفقا بحمداللہ اس وقت تک بالکل خیریت اور اِطمینان سے ہے۔ شروع رجب میں مکۂ معظّمہ حاضر ہوگیا تھا، اِس وقت تک یہیں حاضر ہوں۔ مجھ کو اُمید ہے کہ فلاح وحسنِ خاتمہ کی دُعا سے اس دُورافتادہ کو فراموش نہ فرمائیں گے۔ آیندہ قیام کی نسبت ابھی کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ مولوی شبیر علی صاحب (۱)، مولوی محمد ظفر صاحب، مولوی عبداللہ صاحب وغیرہ حضرات سے سلامِ مسنون فرمادیجیے۔

والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم
فقط بندہ محمود عفی عنہ

← الدین سے بہ درجہاز ایدقابلِ قبول ہونا چاہیے۔ واللہ سبحانہ اعلم، ولا حول ولا قوۃ إلّا باللہ العلی العظیم (امداد الفتاویٰ: ج ۶، ص ۳۴-۲۳۳، کراچی)

(۱) ع: ذِکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے! (شبیر علی تھانوی)

مکۂ معظّمہ

۱۲ محرم، چہار شنبہ (بدھ)

منشی رفیق احمد صاحب کی خدمت میں سلام۔ خدا کرے ان کا رسالہ رُو بہ ترقی ہو۔

مکتوب نمبر ۲:

معدنِ حسنات وخیرات، دام ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نامۂ سامی موجبِ مسرّت وامتنان ہوا، جو ہوا مکرمین ومخلصین کی ادعیۂ مقبولہ کا ثمرہ ہے، اَدَامَ اللہ فیوضہم وبرکاتہم۔ احقر اور رُفقا ومتعلقین بحمد اللہ خیریت سے ہیں، سب کا سلامِ مسنون قبول ہو۔ والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم، فقط!

بندہ محمود عفی عنہ، از دیوبند

دوم شوال، روز یک شنبہ (اتوار)

حق پرستی اور رعایتِ دِین:

ذکر نمبر ۲۴: حضرتؒ کے اِنصاف اور حق پرستی اور رعایتِ دِین کا نمونہ ایک قصے سے واضح ہوتا ہے۔ ایک قصبے میں ایک رئیس اور عالم کے یہاں، جو اپنے ہی مجمع کے ہیں، ایک تقریب تھی۔ احقر بھی اس میں مدعو تھا، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی اور دیگر حضرات بھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رُسومِ بدعت میں سے کوئی رسم وہاں نہیں، اور کیوں کر ہوتی؟ جب کہ صاحبِ تقریب خود بدعت سے مانع تھے، مگر عام برادری کی دعوت تھی، جس کو میں بنابر تجربہ رُسومِ تفاخر میں سے سمجھتا ہوں، اور جن اکابر پر حسنِ ظن غالب ہے وہ اس میں توسع فرماتے ہیں۔ چناں چہ اسی تفاوت کا یہ اثر ہوا کہ میں تو بلا شرکت واپس آگیا اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔ خود اپنے ہی مجمع میں اس کا مختلف عنوانوں سے بڑا

غوغا ہوا، اور مجھ سے تو جب اس اختلاف کے متعلق کسی نے سوال کیا میں نے تو بزرگوں کے ادب کی رعایت ہی مدنظر رکھ کر جواب دیا، مگر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی جو بعض نے سوال کیا تو باوجودے کہ حضرتؒ کے ذمے اس احقر کی رعایت کی کون (سی) ضرورت تھی، لیکن جو جواب عطا فرمایا اس میں جس درجے رعایت ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ جواب یہ تھا کہ

"واقعی بات یہ ہے کہ عوام کے مفاسد کی جس قدر فلاں شخص (یعنی احقر) کو اِطلاع ہے ہم کو اِطلاع نہیں، اس لیے اس نے احتیاط کی۔"

حقیقت یہ ہے کہ ع

بریں نکتہ گر جاں فشانم رواست!

یہ جواب مجھ سے بعض ثقات نے نقل کیا۔

گفتگو سے رائے نہیں بدلا کرتی:

ذکر نمبر ۲۵: اسی قصۂ مذکورہ متصلاً کی نظیر، اسی انصاف اور حق پرستی اور رعایت کا نمونہ یہ قصہ بھی ہے (اور اس وقت اسی پر اس "ذِکرِ محمودؒ" کو ختم بھی کردُوں گا) کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے تو بعض خاص اسباب سے بعض خاص معاملات میں بعض خاص خیالات ظاہر فرمائے اور اعلاناً و عملاً ان میں حصہ لیا، جس کا مبنیٰ محض خلوص کے ساتھ اسلام و اہلِ اسلام کی خدمت تھی۔ چوں کہ وہ مسائل اِجتہادی تھے، جن میں شرعاً گنجایش اختلاف کی ہوتی ہے، اور ان میں بعضے پہلو دُنیوی و دِینی خطرات بھی رکھتے تھے، جو شرعاً واجب التحرز تھے۔ بعض اہلِ علم نے ان خطرات و مضرات پر نظر کر کے ان تحریکات میں رائیاً و عملاً شرکت نہیں کی، اور احقر کا خیال بھی ان ہی علاحدگی رکھنے

والوں کے موافق تھا، اور اس علاحدگی کو اکثر اہلِ محبتِ مفرطہ نعوذ باللہ حضرتؒ کی مخالفت سمجھتے تھے، مگر خود حضرتؒ کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں زیارت کے لیے دیوبند حاضر ہوا تو میرے ساتھ میرے ایک دوست بھی تھے، جو ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، وہ مجھ سے کہتے تھے: میں نے حضرتؒ سے عرض کیا: اشرف اس وقت آیا ہوا ہے، اگر ان اُمور میں گفتگو فرما لیجیے تو شاید رائے متفق ہو جائے؟ ارشاد فرمایا:

"نہیں، مناسب نہیں۔ جو شخص اپنا لحاظ کرتا ہو اس سے ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ نیز گفتگو سے رائے نہیں بدلا کرتی، واقعات سے بدلا کرتی ہے۔"

اللہ اکبر! اس انصاف و رعایت کی کچھ حد ہے؟

نیز ایک صاحب اسی مضمون کے متعلق کہتے تھے کہ وہ دیوبند حاضر تھے، بعض لوگ اس احقر کی شکایتیں ان معاملات میں کر رہے تھے۔ حضرتؒ نے سن لیا، فرمایا:

"افسوس! تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے ہو جس کو میں ایسا ایسا سمجھتا ہوں۔"

(یہاں بعض الفاظ میری شان سے بہت ارفع ہیں، اس لیے میں نے ان کو نہیں لکھا کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک)

اور یہ بھی فرمایا:

"میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے؟ میری ایک رائے ہے، سو اُس کی (یعنی احقر کی) بھی ایک رائے ہے، اس میں اعتراض و شکایت کی کیا بات ہے؟"

نیز بعضے لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان ہی تحریکات کی تقویت کے لیے

تھانہ بھون لانا چاہا اور درخواست کی، تو ایک شخص کہتے تھے کہ حضرتؒ نے یہ جواب دیا:

"وہاں فلاں شخص (یعنی احقر) موجود ہے، میرے جانے سے اس کو تنگی ہوگی۔ کیوں کہ موافقت تو اس کی رائے کے خلاف ہوگی اور عدم موافقت سے شرمائے گا، اس لیے وہاں نہیں جاتا(۱)۔"

سبحان اللہ، اللہ اکبر! میں تو اکثر اوقات اپنے بزرگوں کے ایسے کمالات پیش کر کے دُوسری جماعتوں کو خطاب کر کے کہتا ہوں:

أُولَـئِكَ آبَـائِـيْ فَجِـئْـنِـيْ بِـمِـثْـلِـهِـمْ
إِذَا جَـمَـعَـتْـنَـا يَـا جَـرِيْـرُ الْـمَـجَـامِـعُ

خاتمہ:

اب اس کو ختم کرتا ہوں اور حسرت کے ساتھ تاریخِ وفات سے اِطلاع دیتا ہوں کہ بہ تاریخ ۱۸ر ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ ۳۰رنومبر ۱۹۲۰ء یوم سہ شنبہ (منگل) رہ گذائے عالم بقا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

اس احقر نے محض سہولتِ یادداشت کے لیے ایک مادّہ تاریخ کا سوچا ہے، گو فصیح نہیں ہے، اور اس پر مصرعے بھی لگا دیے، گو شاعر نہیں ہوں۔ وھو ھٰذا:

قطعہ

آہ حضرت شیخ محمود الحسن
راہی جنت شد از دار المحن

(۱) اسی طرح ایک موقع پر یہ اِرشاد فرمایا: "تم کیوں بار بار اس پر اِعتراض کرتے ہو؟ وہ بھی دِین کا ایک کام کر رہا ہے۔" (اشرف)

گفت ہاتف چوں بہ جستم سالِ او
واصل درگاہ جاناں ذُو المنن
۱۳۳۹ھ

اور حضرت رحمہ اللہ کے حاضر باش خواص سے اُمید رکھتا ہوں کہ اگر وقت ملے تو حضرتؒ کے کمالاتِ علمیہ وعملیہ کا مبسوط تذکرہ تحریر فرمائیں، خصوص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا حسین احمد صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ کی توجہ سے اس مقصود کی تکمیل میں بہت کچھ آسانی کی توقع ہوتی ہے۔

واللہ الفاتح لکل ابواب الخیرات وھو الموفق لإتمام الصّالحات!

کتبہ اردء تلامذہ صاحب التذکرۃ

الاحقر اشرف علی

رزقہ اللہ تعالی التّقویٰ والمغفرۃ
۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ
(۲۵ رجنوری ۱۹۲۱ء، بہ روز اتوار)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ اَصْحَابِ الْکَھْفِ: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ نَبَاَھُمْ بِالْحَقِّ

گرشوی در دین مہمانِ خلیل
جا مہا نوشی ازیں خوانِ خلیل

استاذ العلماء والمشائخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری
مہاجر مدنی قدس اللہ سرہٗ
کے حالات وکمالات اور بعض خدمات کا تذکرہ!

خوانِ خلیل

یادگار قلم
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ
اضافات، حواشی، ضمایم
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ

ناشر
مکتبۂ رشیدیہ
بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

تمہید

از: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اس ناکارہ کو ہمیشہ اپنے اکابر کے حالات کے سننے اور جمع کرنے کا، سوانح لکھوانے کا بہت ہی اِشتیاق رہا۔ ''تذکرۃ الخلیل'' میں جیسا کہ خود مولانا (عاشق الٰہی میرٹھی) مرحوم نے بھی تحریر فرمایا، اس ناکارہ کے اِصرار کو بہت دخل تھا۔ اسی طرح حضرت (شاہ عبدالقادر) رائے پوری نوّراللہ مرقدہٗ، چچا جان (مولانا الیاس) قدس سرہٗ، عزیز مولوی یوسف نوّراللہ مرقدہٗ کی سوانحوں کی تالیف میں اس ناکارہ کا بہت دخل رہا، مگر افسوس کہ ''تذکرۃ الرشید'' یعنی سوانح قطب العالم حضرت اقدس گنگوہی اور ''تذکرۃ الخلیل'' جس میں میرے پانچ اکابر کے مختصر حالات ہیں، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب نوّراللہ مرقدہٗ جو اِن دونوں کتابوں کے مصنف تھے، ان کے انتقال کے بعد سے ان دونوں کتابوں کی طباعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔ ہر چند میں نے مولانا مرحوم کے صاحب زادگان پر اِصرار کیا اور تقاضے کیے کہ یہ جواہر پارے، اسی طرح مولانا کی دیگر تصانیف علمی ودِینی ذخیرے کے ساتھ ساتھ بہت ہی مقبولِ عام کتابیں ہیں، مگر ان عزیزوں کو

دُوسرے قصوں کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ بالآخر ''تذکرۃ الخلیل'' تو میں نے گزشتہ سال عزیزم مولوی حکیم محمد اِلیاس سلّمہٗ پر تقاضا کر کے طبع کرائی تھی، اور اس سے پہلے جناب الحاج متین احمد صاحب سے بھی کئی سال سے تقاضا کر رہا تھا اور وہ اس کا اہتمام بھی کر رہے تھے، مگر حالات کی ناسازگاری سے طبع نہ ہوسکی، لیکن بحمد اللہ گزشتہ سال وہ بھی طبع ہو کر شایع ہوچکی، لیکن ہند و پاک میں کتابوں کی آمد و رفت بند ہے (۱)، اور حکیم الیاس صاحب کی مطبوعہ قریب الختم ہے، اس لیے میں نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس کے ساتھ ''خوانِ خلیل'' جو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ نے حضرت سہارن پوریؒ کے وصال پر ایک مختصر سا رسالہ تالیف فرمایا تھا وہ بھی بہ طور ضمیمے کے شایع کر دیا جائے، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ دو ہفتے مختلف احباب کو اس کے ڈھونڈنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑی اور بڑی مشکل سے ملی۔ اس کے سننے سے یہ معلوم ہوا کہ اس میں تو حضرت حکیم الامتؒ نے کوزے میں دریا کو بند کر رکھا ہے اور نہایت اِختصار کے ساتھ جام میں اپنی دُوسری تالیفات کا حوالہ فرما دیا، اس لیے میں نے ''خوانِ خلیل'' کو سنتے وقت ان حوالہ جات کو بھی تلاش کرایا اور ان میں سے جو عام فہم اور محتاج الیہ تھے ان کو تو بہ طور ضمایم کے اس پر نقل کرا دیا، اور جو بہت طویل مضمون تھے، جیسا کہ ایک مضمون خواب کے سلسلے میں مختصر طور سے تو یہاں بھی آیا اور اس کے متعلق مختصر مضمون ضمیمے میں بھی لکھوایا، لیکن اس کے متعلق مختلف علما کے فتاوے ''الامداد'' بابت ماہ شوال، ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ (اگست، ستمبر

---

(۱) تقسیم ملک کے بعد کتابیں تجارتی بنیاد پر آتی جاتی تھیں، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اب بھی تجارتی بنیاد پر کتابیں آنا محال ہے، لیکن ڈاک کا کارندہ رشوت کے عوض کتابوں کا پیکٹ پہنچا دیتا ہے۔ (اعجاز)

۱۹۱۸ء) کے تریسٹھ صفحات پر تھا، وہ تو گویا مستقل ایک کتاب تھی۔ اسی طرح بعض علمی وفقہی مسائل تھے جو عام فہم نہ تھے، اس لیے ان کا مفصل حوالہ لکھوادیا۔ اس سب کے بعد دوستوں کا اِصرار ہوا اور مجھے بھی اچھا معلوم ہوا کہ ''خوانِ خلیل'' کو مستقل بھی چھاپ دیا جائے اور ''تذکرۃ الخلیل'' کے ساتھ ضمیمے کے طور پر بھی چھاپ دیا جائے۔ اس لیے کہ میرے شیخؒ کے حالات اور حضرت حکیم الامت نوّر اللہ مرقدہٗ کے قلم سے نورٌ علیٰ نور ہیں۔ اس لیے آج ۲۲/ذی قعدہ ۱۳۹۱ھ (۹/جنوری ۱۹۷۲ء) کو اس کے ضمایم پورے ہونے کے بعد توکلاً علی اللہ طباعت کے لیے دے رہا ہوں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ !

محمد زکریا

مدرسۂ مظاہر علوم، سہارن پور (یو۔ پی)

خوانِ خلیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ:

بعد الحمد والصلوٰۃ: حضرت مولانا عارف جامیؒ نے مشتریانِ یوسف علیہ السلام کے قصے میں نقل فرمایا ہے: ؎

چو یوسف شد بہ خوبی گرم بازار | شدندش مصریاں یکسر خریدار
بہر چیزے کہ ہر کس دسترس داشت | دراں بازار بیع او ہوس داشت
شنیدم کز غمش زالے بر آشفقت | تنیدہ ریسمانے چند وی گفت
ہمیں بس گر چہ من کاسد قماشم | کہ در سلک خریدارانش باشم (۱)

اسی مخلص بڑھیا کی تقلید ان سطور کی تحریر میں احقر نے اختیار کی ہے کہ ایک حبرِ ہمام و بحرِ قمقام یعنی: ؎

الشیخ مولانا خلیل احمدا

---

(۱) جب حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حسن کی گرم بازاری ہوئی تو سب اہل مصران کے خریدار بن گئے۔ جس مال پر جو شخص قدرت رکھتا تھا اس بازار میں ان کی خریداری کی ہوس رکھتا تھا۔ میں نے سنا کہ ان کے غم سے ایک بڑھیا بہت پریشان سوت کے چند دھاگے لے کر کہہ رہی تھی کہ اگر میرے پاس پونجی کھوٹی ہے تو میرے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے خریداروں کی قطار میں میرا شمار ہو جائے۔ (زکریا)

منکسو حلّة خلة الرحمٰن
وسمی إبراهیم یوسف وقته
من وجهه کالقلب فی اللمعان

المتوفّٰی فی ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ (اکتوبر ۱۹۲۷ء) رحمه الله تعالٰی رحمةً واسعةً وافاض من برکاته علیٰ اهل الدّیار القریبة والشاسعة (۱) کے دریائے کمالات میں سے چند رشحات وقطرات ناظرین مشتاقین کے قلوب وابصار پر بہ صورت رسالہ پاشاں کرتا ہوں، جو بہ مقابلہ اس دریا کے امواج کے (جن کو مولانا قدس سرہٗ کے حذاق عارفین معرفین عن قریب سطح اذہان عشاق معتقدین صادقین پر متلاطم ومتراکم فرمائیں گے) وہی نسبت رکھتے ہیں جو اس بڑھیا کا ریسماں خزائن عزیز سے نسبت رکھتا تھا، جس کے پیش کرنے میں میری بھی وہی نیت ہے جو اس بڑھیا کی تھی، یعنی:

ہمیں بس گرچہ من کاسد قماشم
کہ در سلک خریدار انش باشم

جیسا اس کے قبل اسی نمونے کی دو مختصر یادداشتیں ''یادِ یاراں'' و ''ذِکرِ محمود'' پیش کر چکا ہوں (۲)، اور یہ ماحضر نافع ہونے کی صورت میں چوں کہ مولانا ہی کا فیض ہوگا، اس لیے ممدوح کو حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور ان فیوض کی مبدأیت کو آپ کی شان میزبانی سے تشبیہ دے کر ان فیوض کے مجموعے کو

(۱) حضرت مولانا خلیل احمدؒ جو کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی محبت کے لباس سے آراستہ ہیں، اور حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہم نام اور اپنے زمانے کے یوسف، جن کا چہرۂ انور روشنی میں قلب مبارک کے مانند ہے، جن کی وفات ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ (اکتوبر ۱۹۲۷ء) میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فیوض وبرکات سے دور اور نزدیک سب لوگوں کو مستفیض فرمائے۔ (زکریا)

(۲) یہ دونوں رسالے زیر نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ (اعجاز)

"خوان" کے اور اس کے آحاد کو جامات اطعمہ واشربہ (۱) کے مشابہ قرار دے کر اس مجموعۂ حالات کو "خوانِ خلیل" سے اور ہر جز کو "جام" سے ملقب کرتا ہوں، اور ان ہی مناسبات سے اس رسالے کی لوح پر اس شعر کے لکھنے کا مشورہ دیتا ہوں:

گر شوی در دین مہمان خلیل
جامہا نوشی ازیں خوانِ خلیل

اب وہ جامات پیش کرتا ہوں۔ واللہ یطعم ویسقی وھو یشبع ویروی!

کتبہ اشرف علی عفی عنہ
اوائل رجب ۱۳۴۶ھ (جنوری ۱۹۲۸ء)

نوٹ
حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ نے متن کے بعض جملوں پر اپنے ضمیمے میں وضاحت فرمائی ہے۔ متن میں اس کی نشان دہی کے لیے "ض" بنا کر نمبر لکھ دیا گیا ہے، تاکہ ضمیمہ میں قاری کے لیے آسانی رہے۔ (اعجاز)

(۱) فی القاموس: جام إناء من فضة، وجامات ج اھ، وھو یعم ما للمأکول وما للمشروب۔ (اشرف)

خوانِ خلیل

نیازمندی کی ابتدا:

جام نمبر ا: یوں تو مولاناؒ سے اس احقر کو مدّت سے نیاز حاصل تھا، لیکن زیادہ خصوصیت اس زمانے سے ہوئی جب سے میں کان پور کا تعلق چھوڑ کر وطن میں مقیم ہوا (۱)، اور سہارن پور کی آمدورفت میں کثرت ہوئی، جس میں مظاہر علوم کے سالانہ جلسے کے موقع پر تو گویا بالالتزام حاضری ہوتی تھی، اور متفرق طور پر بھی بہ کثرت آنا جانا رہتا تھا، اور ہر حاضری میں طویل طویل اوقات مولاناؒ کی صحبت میں مستفید رہتا تھا، اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجودے کہ میں ہر طرح چھوٹا تھا، عمر (۲) میں بھی، طبقے (۳) میں بھی، اور علم وعمل میں تو مجھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی۔

---

(۱) حضرت نور اللہ مرقدہٗ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں کان پور سے ملازمت چھوڑ کر اپنے وطن مستقل طور پر خانقاہ امدادیہ میں رونق افروز ہوئے۔ (زکریا)

(۲) حضرت سہارن پوریؒ کی ولادت صفر ۱۲۶۹ھ (دسمبر ۱۸۵۲ء)، اور حضرت حکیم الامت کی ولادت ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ (۱۹/ستمبر ۱۸۶۳ء) چہارشنبہ بہ وقت صبح صادق ہے۔ ومما ینبغی ان یحفظ۔ حضرت سہارن پوریؒ کی وفات ۱۵/ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ (۱۱/اکتوبر ۱۹۲۷ء) بالمدینہ منورہ، اور حضرت تھانویؒ کی وفات ۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ (۱۹/جولائی ۱۹۴۳ء) شب سہ شنبہ ساڑھے دس بجے ہوئی۔ (زکریا)

(۳) حضرت سہارن پوریؒ کی اجازت بیعت از حضرت شیخ المشائخ حاجی صاحب محرم ۱۲۹۸ھ (دسمبر ۱۸۸۰ء)، اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی اجازت شیخ المشائخ مہاجر مکیؒ سے شروع ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) میں ہے، جیسا کہ بہ تفصیل ضمیمے ہے۔ (زکریا)

اس میں تو چھوٹے بڑے ہونے کی نسبت کا ذِکر بھی ایک درجے میں اِدّعا ہے علم وعمل کا، مگر مولاناؒ کا برتاوٴ مساویانہ تو یقینی ہی تھا۔ بعض اوقات ایسا برتاوٴ فرماتے تھے کہ جیسے چھوٹے کرتے ہیں بڑوں کے ساتھ۔ اس سے زیادہ کیا درجہ ہوگا تواضع کا؟ یہ بنا تو یقینی تھی، اور اِحتمال یہ بھی ہے کہ شاید اس واقعے کو بھی دخل ہو کہ مولانا بہ واسطہ (ض ۱) حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے منتسب تھے اور یہ احقر بلا واسطہ (ض ۲)، اگر یہ بھی تھا تو اس حفظ مراتب کا جو کہ حکمتِ عملیہ کا اعلیٰ شعبہ ہے، کامل ثبوت ہوتا ہے۔

ف: تواضع وحفظِ حدود کا کمالاتِ مقصودہ میں سے ہونا ظاہر ہے۔

مجھ سے محبت:

جام نمبر ۲: مولاناؒ نے اپنے ایک معتقدِ خاص سے فرمایا تھا کہ

”مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جس وقت اس کو خبر بھی نہ تھی۔“

ف: اس واقعے میں ایک خاص سنت کا اِتباع ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ

”اگر کسی کو کسی سے محبت ہے تو اس کو خبر کر دے۔“

اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ اس میں تطییب ہے قلبِ مسلم کی۔ نیز جلب ہے اس کی محبت کا اور باہمی تحابب وتوادُد کے ثمرات ظاہر ہیں۔

جام نمبر ۳: باوجود میرے کم مرتبہ ہونے کے گاہ گاہ مجھ کو ہدایا سے بھی مشرف فرمایا ہے۔

ف: اس میں علاوہ سنتِ تہادی کے کہ سبب ہے تحاببِ مطلوب کا، تواضع بہ درجہٴ غایت بھی ہے، کیوں کہ تہادی بہ شانِ خاص تواضع ہی سے ناشی ہے۔

جام نمبر ۴: احقر - مولاناؒ کے سامنے وعظ کہتا ہوا بے حد شرماتا تھا، گو اِمتثالِ امر کے سبب عذر نہ کرسکتا تھا، لیکن مولاناؒ نہایت شوق ورغبت سے اِستماع فرماتے تھے۔

ف: اس میں علاوہ تواضع کے اہتمامِ علم کے فضائل کی بھی تحصیل ہے، جس پر سلف صالح عامل تھے۔

جام نمبر ۵: ایک بار احقر کے مواعظ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ اس کے بیان میں کہیں اُنگلی رکھنے تک کی گنجایش نہیں۔

ف: اس میں حسنِ ظن وسنتِ مدح لتألیف القلب وتحضیض علی الخیر کا ثبوت ظاہر ہے۔

آمد کی کثرت اور تکلف برخاست:

جام نمبر ۶: گاہ گاہ غریب خانے کو بھی اپنے اقدام سے مشرف فرماتے تھے۔ مجھ کو یاد ہے (ض ۳) کہ غالباً جب اوّل بار تشریف آوری ہوئی تو احقر نے جوشِ محبت میں کھانے میں کسی قدر تکلف بھی کیا، اور اہلِ قصبہ میں سے بھی بعض عمایدکو مدعو کردیا کہ عرفاً یہ بھی معزّز ضیف کا اِکرام ہے، (ان بعض عمایدنے میری اس خدمت کا یہ حق ادا کیا کہ بعد جلسۂ دعوت کے مجھ کو بدنام کیا کہ طالبِ علم ہوکر اتنا تکلف کیا؟ پانچ چھ کھانے والوں کے سامنے بہتّر یا باسٹھ برتن تھے۔ میں عدد بھول گیا کہ کون سا فرمایا تھا۔ اس روایت کے قبل مجھ کو تکلف کے مقدار کی طرف اِلتفات بھی نہ ہوا تھا)۔ مولاناؒ نے مزاحاً فرمایا کہ: ''یہ تکلف کیوں کیا گیا؟'' میں نے عرض کیا کہ اس کا سبب خود حضرت ہی ہیں۔ اگر بہ کثرت کرم فرماتے تو ہرگز تکلف نہ کرتا۔ یہ تقلیل سبب ہے اس تکثیر کا۔ اس کے بعد آمد کی تکثیر ہوگئی اور تکلف کی تقلیل۔

ف: اس سے بے تکلفی وسادگی ورعایتِ میزبان ظاہر ہے، اور ان سب کا اخلاقِ فاضلہ سے ہونا ظاہر ہے۔

استفادے میں کبھی تکلف نہیں کیا:

جام نمبر ۷: باوجودے کہ اس احقر کے ساتھ مساویانہ بلکہ اس سے بھی زیادہ تر برتاؤ فرماتے تھے، جیسا کہ جام نمبر ۱ میں مذکور ہوا، لیکن اظہارِ حق کا اس قدر غلبہ تھا کہ اگر میں نے استفادتاً کوئی بات پوچھی تو اس کے جواب میں کبھی تکلف نہیں فرمایا، اور کبھی اَزخود بھی متنبہ فرمایا۔ چناں چہ اس وقت تین مسئلے اس قسم کے میرے ذہن میں حاضر ہیں:

مسئلہ نمبر ۱: میرا ایک دوست سے اس مسئلے میں اختلاف ہوا کہ پشت کی طرف سے فوٹو لینے میں جس میں چہرہ نہ آے، گنجایش ہے یا نہیں؟

جانبین سے مکاتبت کا سلسلہ چلتا رہا، آخر میں احقر نے اس دوست کو مولاناؒ کے فیصلے پر راضی کر کے تحقیقِ مسئلہ کی درخواست کی۔ مولاناؒ نے خوشی سے قبول فرما کر مسئلے کا فیصلہ کر دیا، چناں چہ ہم دونوں نے قبول کر لیا۔ یہ محاکمہ تتمہ جلد رابع فتاویٰ اِمدادیہ (ض ۴) کے آخر میں شایع ہو چکا ہے۔ اس محاکمے کی تمہید میں مولاناؒ کی عبارت قابلِ دید ہے، وھی ھذہ:

> ''بندہ ناچیز بہ اعتبار اپنے علم وفہم کے اس قابل نہیں کہ علمائے اعلام کے اِختلاف کا فیصلہ کر سکے، مگر ہاں اِمتثالاً للامر الشریف اس مسئلے میں جو کچھ خیال میں آیا عرض کرتا ہے...الخ۔''

ف: تواضع اور اِظہارِ حق میں اس طرح جمع کرنا جس درجے کا کمال ہے، ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر ۲: مشتمل بر سوالاتِ متعدّدہ، جزوِ اوّل: بعض روایات میں

(حضرت) ابن عباسؓ سے وارِد ہے:

"اخطا الکاتب فی تستأنسوا، وإنّما هو تستأذنوا"

میں نے مولاناؒ سے بہ ذریعہ خط پوچھا، جس کا جواب نہایت قریب وعجیب ارشادفرمایا جو (ض۵) ''بیان القرآن'' کے حواشی عربیہ متعلقہ آیت:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ (الآیة)

(سورۂ نور: ۲۷)

میں شایع ہوا ہے۔ احقر نے اس خط کو مختصر اور معرب کردیا ہے، جس کا حاصل برتقدیر ثبوت ایسی قراءت کا قراءتِ موجودہ سے منسوخ ہونا اور راوی کو نسخ کی خبر نہ پہنچنا ہے۔

جزوِ ثانی متعلق نبوّت، جزوِ ثالث متعلق رُقومِ مدرسہ، جزوِ رابع متعلق عدّت، یہ سب اجزاء بعینہا فتاویٰ اِمدادیہ، جلد چہارم کے آخر میں بہ عنوان بعضے از تحریرات...الخ۔شایع ہوئے ہیں (ض٦)۔

مسئلہ نمبر ۳: پیرمحمد والی مسجد کی سمت جنوب میں جو سہ دری مسجد سے ملی ہوئی ہے، اس پر سائبان ڈالا گیا، تو مولاناؒ نے اس کے متعلق از خود کچھ تحریر فرمایا، جس کا یہاں سے جواب عرض کیا گیا۔ چند بار اس میں مکاتبت ہوئی، جس میں کوئی اخیر فیصلہ نہیں ہوا۔ اس مکاتبت کا نام ''مسائلة أهل الخلة فی مسئلة الظلة'' ہے، جو ''ترجیح الراجح'' (ض۷) کے حصۂ دوم کے اَخیر کے قریب میں شایع ہوا ہے۔ اس میں مکتوبِ سوم کے شروع میں ایک عجیب دِل ربا جملہ ہے، وهـــی هٰذه:

''گرامی نامہ موجبِ برکت ہوا، کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلے کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں؟ مبادا تکرار موجبِ بار ہو، بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ اور عرض کردوں...الخ۔''

ملاحظہ فرمایا جاوے اس جملے میں رعایتِ حق ورعایتِ خاطر دونوں کو کس طرح جمع فرمایا گیا ہے! اس کا اثر احقر پر یہ ہوا کہ اس پر جو عرض کیا گیا باوجودے کہ اس کا جواب نہیں آیا، مگر مجھ کو ایک تنبیہ میں اس لکھنے کی ضرورت ہوئی کہ

''اس جواب نہ آنے کو حجت نہ سمجھا جاوے۔ الیٰ قولہ: اس باب میں اہلِ علم سے مزید تحقیق کر لی جاوے۔''

تعلق ومحبت:

جام نمبر ۸: ایک بار بعض عنایت فرماؤں نے بعض حکایات کی نسبت میری طرف خلافِ واقع کر دی، جس کا چرچا اپنے مجمع میں پھیل گیا۔ میں اس وقت میرٹھ میں تھا اور اس چرچے سے بالکل غافل۔ مجھ کو خیر خواہ دِل سوز نے یہ خبر پہنچائی۔ مجھ کو بہت رنج ہوا اور سب سے زیادہ خیال مجھ کو مولاناؒ کے تکدّر کا تھا، اس لیے میں نے اس واقعے کی حقیقت مولاناؒ کی خدمت میں لکھ بھیجی، وہاں سے حسبِ ذیل جواب آیا:

''معلوم نہیں لوگوں کو کیا مزا آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہلِ خیر کے قلوب کو دُکھاتے ہیں؟ مجھ ناچیز کو جو تعلق اور محبت پہلے تھا وہی عقیدت بحمد اللہ موجود ہے:

آں نیست کہ حافظ را مہرت رود از خاطر
آں وعدۂ پیشینش تا روز پسیں باشد

جو قلبی محبت اور جس کو ذخیرۂ آخرت سمجھ رکھا ہو، وہ اِن شاء اللہ بدل نہیں سکتی۔ جو روایتیں پہنچی ہیں ان میں مبالغے سے بہت کام لیا گیا ہے۔'' (انتہی ملخصاً بقدر الضرورۃ)

یہ واقعہ ''حکایات الشکایات'' (ص ۸) حکایت نمبر ۴ کے آخر میں مذکور ہے۔ بعد اِختتام قصہ کے مولاناؒ نے مجھ سے فرمایا کہ ''اس دِل سوز خیر خواہ کے

ذریعے سے بدون اپنی طرف نسبت کرنے کے میں نے ہی یہ خبر پہنچائی تھی، تاکہ تاخیر تدارک سے بات بڑھ نہ جائے۔''

ف: اس سے مولاناؒ کی کتنی بڑی خیر خواہی ثابت ہوتی ہے کہ میری بے خبری کو صعوبت تدارک کی مصلحت سے گوارا نہیں فرمایا، اور اپنی طرف منسوب نہ فرمانا ممکن ہے کہ اس لیے ہو کہ زیادہ رنج نہ ہو، کیوں کہ راوی جس قدر زیادہ ثقہ ہوتا ہے اسی قدر روایت کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بضمائر عبادہ!

دین کی حفاظت کا اہتمام:

جام نمبر ۹: ایک شخص نے اپنی ایک حالت کی جس کا کچھ حصہ نوم تھا اور کچھ یقظہ مشابہ بہ نوم تھا، اور اس حالت میں غیر اختیاری طور پر ایک غیر مشروع کلمے کا زبان سے نکلنے کی اِطلاع دے کر تحقیق چاہی تھی۔ میں نے قواعدِ شریعت وطریقت سے اس کا جواب لکھ دیا، جس کا حاصل سائل کا معذور ہونا تھا۔ چوں کہ طریقت اس وقت کالمہجور ہوگئی ہے اس لیے اس جواب کی حقیقت نہ سمجھنے سے اکثر عوام اور بعض اہلِ علم میں بھی اس کے متعلق ایک شورش برپا ہوگئی (۱) کہ اس کو معذور کیوں قرار دِیا؟ جس کی تحقیق احقر نے ''حکایات الشکایات'' (ص ۹) کی حکایتِ سوم میں لکھی ہے۔ مولاناؒ نے شفقت سے زبانی مشورہ دیا کہ ''اس سائل کے قابلِ توبیخ ہونے کے متعلق کوئی تحریر شایع ہوجائے تو شورش کم ہوجائے اور عوام کا دِین بھی محفوظ رہے''۔ میں نے اس باب میں اپنا شرحِ صدر نہ ہونا عذر میں پیش کیا اور عرض کیا کہ آپ اور دُوسرے علما کچھ تحریر فرمائیں تو میں شایع کردُوں۔ اس کو منظور فرمایا۔ چناں چہ میں نے سوال مرتب کرکے مختلف علما سے رُجوع کیا، جس میں مولاناؒ بھی تھے۔ سب نے اپنی اپنی رائے کے موافق جواب

---

(۱) اس زمانے میں اخبارات واشتہارات میں اس پر بڑا ہنگامہ اور غوغا قایم تھا۔ (زکریا)

لکھا جو ''الامداد'' شوال ۱۳۳۶ھ (جولائی ۱۹۱۸ء) میں شایع ہوئے ہیں۔

ف: اس میں بھی وہی خیر خواہی اور اس کے ساتھ دِین کی حفاظت کا اِہتمام ظاہر ہے۔

جام نمبر ۱۰: اس قصہ مذکورہ کا اثر عوام میں کسی قدر باقی تھا کہ اس اثنا میں مدرسۂ مظاہر علوم سہارن پور کے جلسۂ سالانہ کا موقع آ گیا۔ حسبِ دستور میں بھی حاضر ہوا۔ چوں کہ اس جلسے میں احقر کا معمول وعظ بیان کرنے کا تھا، مولاناؒ نے بہ مصلحت براءت عن التہمۃ مجھ سے فرمایا کہ ''اس وقت بڑا مجمع موجود ہے، اگر اُس واقعۂ خواب کے متعلق کچھ بیان کر دیا جائے تو اچھا ہے، تاکہ عوام کے شکوک رفع ہو جائیں۔'' احقر نے عرض کیا کہ مجھ کو تو اس کے متعلق کچھ بیان کرنے سے شرم و عار آتی ہے، کیوں کہ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں اپنا تبریہ کروں، اور اِنسان اپنا تبریہ ایسی بات سے کیا کرتا ہے جس کا کسی درجے میں اِحتمال ہو، پس تبریہ کرنا اس کے اِحتمال کو تسلیم کر لینا ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ ''اچھا! اگر تم اپنی زبان سے تبریہ نہیں کرتے تو ہم میں سے کوئی شخص اس کے متعلق بیان کر دے؟'' احقر نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہوا تو میں جلسے سے اُٹھ جاؤں گا۔ مولاناؒ نے فرمایا: ''نہیں نہیں! تم کو گوارا نہیں تو پھر کوئی ضرورت نہیں''۔ یہ سب مکالمہ وعظ ''مظاہر الاقوال'' کی تمہید میں مذکور ہے (ص ۱۰)۔ اس مشورے میں بھی علاوہ خیر خواہی کے اِتباعِ سنت تھی، یعنی تہمت کا رفع کرنا ہے، جیسا حضرت صفیہؓ کے واقعۂ اِعتکاف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مگر یہ مشورہ چوں کہ محلِ اِجتہاد تھا، جس کی وجہ احقر کے جواب میں مذکور ہو چکی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت اس امر میں ہے جو محلِ اِشتباہ ہو، جب یہ نہیں تو اِحتمالاتِ غیر ناشی کا کہاں تک انسداد کیا جائے؟ یوں تو جواب دینے کے بعد بھی اس میں پھر شبہات پیدا کیے

جاسکتے ہیں، تو پھر اس کے لیے تو ایک محکمے کی ضرورت ہوگی۔ یہ توجیہ ہے میرے جواب کی، مگر میرے اس عذر کے قبول فرمالینے کے بعد جب بیان ہوا تو اِتفاق سے حفظِ لسان و مذمتِ بہتان کا۔ چناں چہ اس وعظ کے ملاحظے سے ظاہر ہوگا، جس سے بلا اِختیار مولاناؒ اور بدوں (بلا) قصد احقر کے ایک کرامت مولاناؒ کی ظاہر ہوئی کہ جس چیز کو مولاناؒ کا جی چاہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو واقع فرمادیا (ض ۱۱)، اسی کو عارفِ رُومیؒ فرماتے ہیں:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مراد متقیں

فتوے پر عمل اور تقوے پر عمل:

جام نمبر ۱۱: ایک تقریب غسلِ صحتِ ختنہ میں اِتفاق سے یہاں سے احقر اور سہارن پور سے مولاناؒ، اور دیوبند سے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصبے میں مجتمع ہوگئے، مگر بعض عوارض کے سبب میں تو بلا شرکت واپس آگیا، اور دیگر حضرات نے ان عوارض کی طرف اِلتفات نہیں فرمایا اور شرکت فرمالی۔ اس کے بعد مولاناؒ سے کسی نے اس کی وجہ پوچھی، کیسا تواضع کا جواب ارشاد فرمایا کہ ''ہم نے فتوے پر عمل کیا اور فلاں شخص (یعنی احقر) نے تقوے پر عمل کیا۔''

ف: اس جواب سے جس قدر تواضع اور اِختلافی امر میں شق مقابل کے اِختیار کرنے والے کے عمل کی حسن توجیہ مرعی ہے ظاہر ہے، اور حضرت مولانا دیوبندیؒ نے جو جواب عطا فرمایا، وہ رسالہ ''ذِکرِ محمود'' نمبر ۲۴ میں مع تفصیلِ قصہ مذکور ہے (ض ۱۲)۔

سلف جیسی تواضع:

جام نمبر ۱۲: مولاناؒ میں حضراتِ سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل و اِشکالاتِ علمیہ میں اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ فرماتے تھے، اور چھوٹوں کے معروضات کو شرحِ صدر کے بعد قبول فرمالیتے تھے۔ چناں چہ بعض واقعات نمونے کے طور پر معروض ہیں:

واقعہ نمبر ۱: ایک بار سفرِ بھاول پور میں اس احقر سے ارشاد فرمایا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ ہدایا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے سے اِشرافِ نفس نہ ہو، مگر سفر میں اکثر داعی کی عادت ہوتی ہے کہ مدعو کو کچھ ہدیہ دیتے ہیں، اس عادت کے سبب اکثر خطور بھی ایسے ہدایا کا ذہن میں ہوجاتا ہے، سو کیا خطور بھی اِشرافِ نفس و اِنتظار میں داخل ہے، جس کے بعد ہدیہ لینا خلافِ سنت ہے؟

اس حقیر میں کیا قابلیت تھی کہ ایسے عظیم الشان عالم اور عارف کے اِستفسار کا جواب دے سکوں، لیکن چوں کہ لہجہ اِستفسار امر بالجواب پر دال تھا، اس لیے الامر فوق الادب کی بنا پر جواب عرض کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اس اِحتمال کے بعد دیکھا جاے گا کہ اگر وہ اِحتمال واقع نہ ہو تو آیا نفس میں کچھ ناگواری پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ناگواری ہو تو اس اِحتمال کا خطور اِشرافِ نفس ہے، اور اگر ناگواری نہ ہو تو اِشرافِ نفس نہیں ہے خالی خطرہ ہے، جو اَحکام میں مؤثر نہیں۔ اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور دُعا دِی (ص ۱۴۳)۔

ف: اس واقعے میں مولاناؒ کے چند کمالات ثابت ہوتے ہیں:

ایک تواضع، جس کے سلسلے میں یہ واقعہ ذِکر کیا گیا ہے۔

دُوسرے دقیق تقویٰ کہ اِشراف کے اِحتمالِ بعید تک نظر پہنچی اور اس پر عمل کا اِہتمام ہوا۔

تیسرے اِتباعِ سنت جیسا کہ ظاہر ہے۔

چوتھے اپنے معاملے میں اپنے نفس کو متہم سمجھا کہ اپنی رائے پر وثوق نہیں فرمایا، ورنہ جس کی نظر اتنی دقیق ہو کیا اس فیصلے تک وہ نظر نہیں پہنچ سکتی تھی؟

واقعہ نمبر ۲: ایک بار خود اِفادتاً فرمایا، اور زیادہ یاد یہ پڑتا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے نقل فرمایا تھا کہ ''قرآن مجید میں جو اَوقافِ لازمہ ہیں وہ ایسے ہی مواقع پر ہیں جہاں وصل کرنے سے ایہام خلافِ مقصود کا ہوتا ہے، چناں چہ ظاہر ہے، مگر اس آیت میں کفار کا قول منقول ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا لا سُبْحٰنَهٗ ط (سورۂ بقرہ:۱۱۶)

اور وَلَدًا پر وقف نہیں، حال آں کہ قاعدۂ مذکورہ کا مقتضا یہاں پر لزومِ وقف تھا، کیوں کہ وقف نہ ہونے سے ایہام ہوتا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ بھی ان ہی قائلین کا قول ہے، حال آں کہ یہ ان کے قول اتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا کا رَدّ اور اِبطال ہے۔ سو اس میں نکتہ یہ ہے کہ تنزیہ میں جہاں تک ہو تعجیل کی جائے، تالی یا سامع کو نافین تنزیہ کے قول کے بعد ذرا بھی اِنتظار نہ ہو کہ اس قول کے متعلق کیا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔ باوجودے کہ خود یہ نکتہ اِرشاد فرمایا، مگر ایسے ہی ایک مقام کے متعلق (جس کی تعیین مجھ کو یاد نہیں رہی) احقر سے فرمایا کہ یہاں دفعِ ایہام کے لیے وقف ہونا لازم تھا، مگر اَئمۂ وقف نے یہاں وقف کا حکم نہیں فرمایا۔ مجھ کو وہ نکتہ یاد آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک بار آپ نے یہ نکتہ فرمایا تھا، یہاں بھی وہی نکتہ تعجیل اِبطالِ باطل ہو سکتا ہے۔

ف ۱: علاوہ تواضع کے اس اِحتیاطِ بلیغ کو ملاحظہ فرمایا جائے کہ باوجودے کہ

اس نکتے پر نظر تھی، مگر خصوصیتِ مقام کے سبب دُوسرے سے مشورہ فرمایا کہ شاید یہاں کوئی دُوسرا داعی ہو؟ علمائے رُسوم ایسی احتیاطیں کہاں کرتے ہیں؟ یہ اہلِ حقایق ہی کا حصہ ہے۔

ف ۲: اس نکتۂ مذکورہ کے علاوہ احقر کے ذہن میں ایسے مقامات کے متعلق ایک اور حقیقت آئی ہے، بہ نظر علما کی نظرِ ثانی کے عرض کرتا ہوں کہ ایہام کے مواقع تتبع سے دو قسم کے معلوم ہوئے ہیں: ایک وہ کہ اہلِ حق کی طرف اِنتسابِ باطل کا ایہام ہو۔ دُوسرے وہ اہلِ باطل کی طرف اِنتسابِ حق کا ایہام ہو۔ سو اَوّل قسم کے مواقع میں تو وقف لازم کلی ہے، اور دُوسرے قسم کے مواقع میں وقف لازم اکثری ہے۔ علمائے وقف نے ایسے مواقع پر اس کا زیادہ اِہتمام واِلتزام نہیں کیا، جس کا مبنی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اہلِ حق سے تو صدور باطل کا منکرِ شرعی ہے تو اس ایہام کا دفع زیادہ مہتم بالشان ہے، اور اہلِ باطل سے صدور حق کا منکرِ شرعی نہیں، لأن الکذوب قد یصدق، بلکہ یہ صدور خود قرآن میں منقول ہے، جہاں منافقین کا ذِکر ہے۔ چناں چہ دُوسرے قسم کے بعض مواقع کا ذِکر کرتا ہوں، جس سے میرا دعویٰ اکثریت کا ثابت ہوتا ہے۔

سورۂ منافقون کی اوّل آیت میں منافقین کا قول:

نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ

منقول ہے، اور یہاں علما نے وقف لازم کیا ہے، تاکہ اس کے بعد کا قول:

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ

کی نسبت ان کی طرف متوہم نہ ہو، تو یہاں تو ایہام کا اِعتبار کیا گیا، اور اسی سورت میں رُکوعِ اوّل کے ختم کے قریب منافقین کا قول:

لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ

منقول ہے، اور اس کے متصل ہی اس کا رَدّ:

وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (آیت ۷)

منقول ہے، جو حق تعالیٰ کا قول ہے، مگر یَنْفَضُّوْا پر وقف لازم نہیں تو یہاں اس ایہام کا اِعتبار نہیں کیا گیا۔

اسی طرح اسی کے بعد ان کا دُوسرا قول منقول ہے:

لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ

اور اس کے متصل ہی اس کا رَدّ

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (آیت ۸)

منقول ہے، جو حق تعالیٰ کا قول ہے، مگر الْاَذَلَّ پر وقف لازم نہیں، تو یہاں بھی اس ایہام کا اِعتبار نہیں کیا گیا۔ پس ثابت ہوا کہ ایہام ثانی کا اِعتبار اکثری ہے کلی نہیں۔ سو اسی بنا پر وَلَدًا پر وقف لازم نہ ہونے کو بھی مبنی کر سکتے ہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ!

واقعہ نمبر ۳: ایک شخص نے مولاناؒ کے رُو بہ رو ایک حکایت بیان کی کہ ایک شخص مر گیا تھا، تھوڑی دیر میں وہ تو زِندہ ہو گیا اور اسی نام کا ایک دُوسرا شخص اسی وقت مر گیا، اور پہلے مرنے والے نے بیان کیا کہ مجھ کو ایک مقام پر لے گئے، وہاں پیشی کے وقت کہا گیا کہ اس شخص کو نہیں بلایا گیا بلکہ دُوسرے شخص کو بلایا گیا ہے، چناں چہ مجھ کو دُنیا میں لوٹا دیا اور دُوسرے کو دُنیا سے بلایا گیا۔

یہ حکایت بیان کر کے پوچھا کہ ''کیا ایسا ممکن ہے؟''

بعض اوقات کسی دُوسری طرف توجہ ہونے سے بعض پہلوؤں پر نظر نہیں

جاتی، کچھ نرم سا جواب فرمادیا۔ میں نے ادب سے عرض کیا کہ یہ تو ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ اگر ملک الموت کو ایسی غلطی ہوسکتی ہے تو ملک الوحی سے بھی ہوسکے گی؟ پس کسی غالی کے اس قول کی صحت کی گنجایش نکل آے گی: ''جبریل غلط کردہ مقصود علی بود''۔ اور اس حکایت کی توجیہ صحیح اور سہل یہ ہے کہ وہ مریض مبرسم یا مسکوت تھا، اور اس میں اس کا متخیلہ فاسد ہوگیا تھا۔ مولاناؒ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور نہایت اِنبساط کے ساتھ اس کی تصویب فرمائی۔

ف ۱: مولاناؒ کا کمالِ حق پرستی جس قدر اس سے واضح ہے محتاجِ بیان نہیں۔

ف ۲: اس کے قبل ایسا ہی واقعہ احقر کو حضرت مولانا یعقوب صاحب قدس سرہٗ کے حضور میں پیش آیا۔ مولاناؒ کے جواب کے بعد یہی تقریر میں نے وہاں بھی کی تھی، مولانا قدس سرہٗ نے بھی اس کی تصویب فرمائی، اور اس کے قبل بھی ایسی ہی حکایت میں نے حضرت مولانا الشیخ محمدؒ سے وعظ میں سنی تھی، میں اس وقت بچہ تھا، کیا عرض کرتا، اور نہ مولانا کی تحقیق اس مجلس کی مجھ کو یاد رہی۔

جام نمبر ۱۳، تتمہ جام نمبر ۱۲: ایک بار مجھ سے اِرشاد فرمایا کہ

''حدیث میں ہے:

لَنْ يُّغْلَبَ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا عَنْ قِلَّةٍ

اور اس میں کوئی قید مذکور نہیں، تو کیا یہ مطلق ہے اور ہر صورت کو شامل ہے؟ گو مقابلے میں لاکھوں کافر ہوں یا یہ کہ کسی اور دلیل سے مقید ہے؟

اِطلاق پر یہ اِشکال ہے کہ بہت جگہ اس عدد سے زیادہ ہونے کی صورت میں بھی مسلمان مغلوب ہوگئے ہیں۔''

میں نے عرض کیا کہ ظاہر حدیث کا تو اِطلاق ہی ہے، اور بدوں (بلا) دلیلِ قوی کے تقیید کی کوئی وجہ نہیں، اور مسلمانوں کا کہیں مغلوب ہونا کوئی دلیل نہیں،

کیوں کہ جہاں مسلمان مغلوب ہوئے ہیں سبب اس کا کوئی علت ہے نہ کہ قلت، اور وہ علت خواہ کوئی اَمرِ ظاہر ہو جیسے نااِتفاقی، خواہ کوئی اَمرِ باطن ہو جیسے عُجب ونظر اِلی الاسباب ونحوہما، جیسا غزوۂ حنین میں مسلمان بارہ ہزار اور کفار چار ہزار (کما في الجلالین)، مگر اوّل میں مسلمان مغلوب ہوگئے، جس کا سبب عُجب بالکثرت تھا (کما فی القرآن المجید: اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (سورۂ توبہ: ۲۵))، پھر آخر میں وہی مغلوب غالب ہوگئے (کما قال تعالیٰ: ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (سورۂ توبہ: ۲۶))، اور یہ اِنزالِ سکینہ مشروط ہے زوالِ سببِ مغلوبیت کے ساتھ کہ وہ عُجب ہے، اور یہ زوال توبہ ہے، اھ۔ قولی بمعناہ۔ مولاناؒ مسرور ہوئے اور اس کو پسند فرمایا۔

ف: اس سے مولاناؒ کی تواضع اور عدمِ اِستنکاف فی طلب الحق وسعی زیادت فی العلم ظاہر ہے، جس میں اِمتثال ہے اَمرِ حق رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ (سورۂ طٰہٰ) کا۔

راہِ حق میں تکلیف کی لذت:

جام نمبر ۱۴: ایک سفر میں مولاناؒ کی معیت میں ایک ہم وطن دوست کی طلب پر جودھ پور جانا ہوا اور لوگوں کی درخواست پر احقر کے متعدّد بیانات ہوئے، جن سے بفضلہٖ تعالیٰ بہت نفع ہوا اور اہلِ بدعت کے خیالات میں بھی ایک درجے میں نرمی وحسنِ ظن پیدا ہوگیا۔ ہر بیان کے ختم پر آیندہ بیان کے لیے لوگوں کی درخواست پر وقت اور موقع کا اعلان کردیا جاتا تھا۔ ایک شب میں ختم وعظ پر ان دوست صاحب نے ایسے موقع کے لیے اعلان کردیا جہاں وعظ کی درخواست نہ تھی اور وہ محلّہ تمام تر اہلِ فساد اور اہلِ عناد کا تھا۔ اپنے نزدیک انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ صبح کو جمعہ تھا اور اس محلے کی مسجد میں جمعہ بھی ہوتا تھا، تو ان کو خیال یہ ہوا کہ اس طرح سے اہلِ محلّہ کے کان میں حق پہنچ جائے گا، مگر اس میں خرابی یہ

ہوگئی کہ اوّل تو اس محلے کے اکثر لوگ سخت مبتدع و متعصب تھے، پھر خصوصیت کے ساتھ ان کو ان دوست صاحب سے پہلے سے کچھ رنج بھی تھا، جس کا سبب جس طرح اہلِ محلّہ کی کج فہمی تھی کسی قدر ان دوست صاحب کی تیز زبانی بھی تھی۔ ان لوگوں کو یہ اعلان نہایت ناگوار ہوا، اور وہ یوں سمجھے کہ انہوں نے ہم کو زک دینے کے لیے یہ کارروائی کی ہے، اور تہیہ کرلیا کہ وعظ نہ ہونے دیں گے۔ ان دوست صاحب کو بھی قرائن سے اس کا خطرہ ضرور تھا، انہوں نے یہ انتظام کیا کہ مجسٹریٹ صاحب کو جو کہ گلاوٹھی کے رہنے والے اور خوش عقیدہ شخص تھے، ایک درخواست دے دی کہ عین موقع پر پولیس کا انتظام کردیا جائے، تاکہ کوئی فتنہ وفساد نہ ہو، چناں چہ درخواست منظور ہوکر ایک سب انسپکٹر مع چند جوانوں کے حاضر رہنے کے لیے مامور ہوگئے۔ ہم لوگوں کو اس کی اطلاع عین اس وقت ہوئی جب کہ جمعہ میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے اپنی طبیعت اور مذاق کے موافق یہ رائے قایم کی کہ ایسی تشویش کی جگہ جانا نہ چاہیے، اور تہیہ وعظ کا دِل سے نکال دیا اور اس رائے کو مجمع میں ظاہر کردیا۔ ان دوست صاحب نے تو یہ جواب دیا کہ سب لغو روایتیں ہیں، اور یہ راوی جنہوں نے یہ حکایت کی تھی بزدل اور کم ہمت ہیں۔ یہ ہر جگہ یوں ہی ڈر جاتے ہیں، ضرور چلنا چاہیے، اور مولاناؒ نے فرمایا کہ ”اگر ایسا ہو بھی تب بھی تبلیغِ حق میں ایسے اُمور کی پروا نہ کرنا چاہیے۔“ ان دوست کی رائے کی تو مجھ کو کچھ وقعت نہیں ہوئی، کیوں کہ اس کا منشا میرے خیال میں دُنیا تھی، مگر مولانا کے اِرشاد پر میں خاموش ہوگیا، گو میری رائے اب بھی وہی تھی کہ جانا مناسب نہیں، مگر دو وجہ سے موافقت کرلی: ایک اس وجہ سے کہ منشا اس رائے کا دِین ہے، گو وہ اَمرِ اِجتہادی ہے، جس میں موافقت واجب نہیں مگر ناجایز بھی نہیں۔ دُوسرے اس وجہ سے کہ جب مولاناؒ

جانے کو تیار ہیں تو میں کیا چیز ہوں کہ اپنی جان بچاؤں؟ غرض سارا مجمع وہاں پہنچا مگر رنگ بدلا ہوا پایا۔ نہ کسی نے سلام کیا، نہ کلام کیا، اور اِمامت کے لیے تو کیا پوچھتے؟ نماز سے فراغت ہوئی، ان دوست صاحب نے اعلان کیا کہ وعظ ہوگا۔ فوراً محلے کے ایک شخص نے نہایت تند آواز سے کہا کہ وعظ نہ ہوگا۔ پھر کیا تھا، دونوں طرف سے آویزش ہوگئی اور اس قدر شوروغل ہوا کہ خدا کی پناہ۔ جمعہ کی سنتیں بھی بھول گئے اور اس فرض میں مشغول ہوگئے۔ میں اور مولاناؒ ایک کنارے پر سنتیں پڑھنے لگے، مگر مولاناؒ تو مطمئن اور میں متفکر کہ دیکھیے اس کا کیا انجام ہوتا ہے؟ اور پولیس کا کہیں نام ونشان نہیں۔ یہاں تک اِختلاف کی نوبت پہنچی کہ ایک شخص جا کر منبر پر بیٹھ گیا۔ یہ سمجھا کہ جب منبر پر میرا قبضہ ہوجائے گا پھر وعظ کیسے ہوگا؟ اس سے جہل کا اندازہ کرلیا جائے۔ ایک خاں صاحب ہمارے محبین میں اس مزاج کے تھے، وہ خنجر لے کر اس منبر نشین پر حملہ آور ہوئے۔ ایک خاں صاحب ٹونک کے جو سنجیدہ مزاج تھے، اس وقت موجود تھے، انہوں نے حملہ آور صاحب کا پیچھے سے ہاتھ پکڑلیا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ ابھی سب پھنس جائیں گے۔ وہ خفا ہوکر اس مجمع سے چلے گئے اور یہاں شوروغل کی وہی حالت۔ جب میں سنتیں پڑھ چکا اور معلوم کرلیا کہ یہ سارا غیظ اس اِحتمال پر ہے کہ کہیں وعظ نہ ہونے لگے، تو میں نے اس فتنے کے سرغنے کو اپنے پاس بلایا، غنیمت ہے کہ وہ آبیٹھے اور نہایت غصّے سے کہا: کہیے! میں نے کہا کہ کیا تم کو یہ شبہ ہے کہ وعظ ہوگا؟ سو سن لو وہ واعظ میں ہوں، اور میرا وعظ ایسا ارزاں نہیں ہے کہ کسی کے سر ہوکر کہوں۔ میں تو بہت خوشامد کرا کر وعظ کہتا ہوں، اور اس حالت میں تو میں کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتا، تم اطمینان رکھو، میں ہرگز وعظ نہ کہوں گا، بلکہ اب تو اگر تمام اہلِ محلّہ بھی درخواست کریں تب بھی نہ کہوں، تم لڑو مت، اور یہ

اعلان میرے مشورے سے نہیں ہوا بلکہ خلافِ مزاج ہوا۔ یہ سنتے ہی وہ شخص ٹھنڈا ہوگیا اور اس کے ٹھنڈے ہونے سے سب خاموش ہوگئے۔ میں نے بہ واسطہ دُوسرے شخص کے اس کے بعد یہ قول سنا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ ان لوگوں کی کیا بات ہے، ان کی تو جوتیاں ہم اپنے سر پر رکھ لیں، یہ سارا فساد فلاں شخص کا ہے جس نے اپنی رائے سے اعلان کردیا، اور یہ بھی مسموع ہوا کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم کو وعظ ہونا ناگوار نہ تھا بلکہ یہ متغلبانہ تصرف ناگوار ہوا۔ ہم کو خاص طور پر اِطلاع کی جاتی، ہم خود حاضر ہوکر وعظ کی درخواست کرتے، پھر آنے والوں کے لیے خاص طور پر فرش کا، برف کا، شربت کا انتظام کرتے، اس طرح سے ہماری سخت اہانت تھی جو ہم کو گوارا نہیں ہوا۔ جب فضا میں سکون ہوا ہم لوگ مسجد سے واپس آرہے تھے کہ سب انسپکٹر صاحب مع گارڈ کے راستے میں ملے، کہنے لگے کہ چلیے وعظ کہیے! میں نے کہا: سبحان اللہ! کیا موقع پر پہنچے ہیں؟ یہاں تو خون ہوجاتا، آپ کا آنا کس مصرف کا ہوا؟ اور اَب وعظ نہیں ہوسکتا۔ وعظ کیا ہوا کھیل ہوا۔ یہ وہی بات ہوئی: ع

پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

اور وہ بات ہوئی: ع

ہماری جان گئی، آپ کی ادا ٹھہری!

اس وقت مولاناؒ یہ فرمارہے تھے کہ ''راہِ حق میں ایسی کلفت بھی کیسی لذّت بخش ہے!''

ف: مقصود اس قصے کے نقل کرنے سے مولاناؒ کا یہ قول نقل کرنا تھا، جس سے مولاناؒ کا مذاق:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ

(سورۂ لقمان: ۱۷)

کے اِتباع کا کس قدر وضوح سے ثابت ہوتا ہے، جس میں اپنی ہمت کو قاصر دیکھتا تھا۔ آخر ضعیف وقوی اور ناقص وکامل میں فرق تو ہونا چاہیے۔ ولنعم ما قیل فی مثل ھذا: ؎

نساز وعشق را کنج سلامت
خوشا رُسوائی کوئے ملامت

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ!

جس کی وجہ سے ادب ہے وہ دیکھتا ہے:

جام نمبر ۱۵: ایک سفر میں مولاناؒ کی معیت میں بہ سواری ریل بھاول پور سے واپسی ہورہی تھی، اِتفاق سے اس درجے میں صرف میں اور مولاناؒ ہی تھے، اور رُفقا دُوسرے درجے میں تھے۔ ظہر کا وقت تھا، گرمی سخت تھی اور پسینہ کثرت سے نکل رہا تھا۔ مولاناؒ غایت تواضع اور بے تکلفی سے پنکھا ہاتھ میں لے کر مجھ کو ہوا کرنے لگے، میں اس کا تحمل کب کرسکتا تھا؟ پریشان ہوکر پنکھا پکڑلیا۔ فرمانے لگے: ''کیا حرج ہے؟ کوئی دیکھتا تھوڑا ہی ہے۔''

یہ اس لیے فرمایا تھا کہ اس وقت درجے میں کوئی تیسرا نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ دیکھتا تو ہے۔ فرمایا: کون دیکھتا ہے؟ میں نے کہا کہ جس کے لیے میں آپ کا ادب کرتا ہوں وہ دیکھتا ہے۔ ہنسنے لگے اور پنکھا چھوڑ دِیا۔

ف: کیا انتہا ہے اس بے نفسی کی کہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ برتاؤ، اور اس سے بڑھ کر یہ کمال ہے کہ جب دیکھا کہ طبیعت پر گرانی ہے تو اپنے اِرادے پر اِصرار نہیں فرمایا، اور یہ کمال بڑھ کر اس لیے ہے کہ پہلے عمل میں تو اپنے رفیق کے جسم کی رعایت تھی اور دُوسرے عمل میں قلب کی رعایت، اور ثانی کا اوّل سے

اکمل ہونا ظاہر ہے۔

محنت ومشقت کے کام میں آگے بڑھنا:

جام نمبر ۱۶: مجھ کو متعدّد سفروں میں مولاناؒ کی معیت کا اِتفاق رہا، میں بہ کثرت دیکھتا تھا کہ محنت مشقت کا کام کرنے میں، بوجھ اُٹھانے میں نہ کسی رفیق کا انتظار فرماتے تھے اور نہ کسی اَجیر کا۔ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے کو آمادہ ہوجاتے تھے۔ گو خدام اس کی تکمیل نہ ہونے دیتے تھے، مگر بعض اوقات خدام سے سبقت فرما جاتے تھے۔

ف: اپنا، یا رُفقا کا کام اپنے ہاتھ سے کرنا عین اِتباعِ سنت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہم راہیوں سے ممتاز ہوکر نہ رہتے تھے، خصوص سفر میں، اور اکثر کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔

کیسا مزے کا جواب، مولاناؒ کا حلم اور مولانا تھانویؒ کا غصہ:

جام نمبر ۱۷: ایک بار میں سہارن پور غالباً جلسۂ مدرسہ میں حاضر ہوا، بعد جلسہ کے ایک گاؤں والوں نے (جس کا نام غالباً شیخو پورہ ہے) مولاناؒ کو مع دُوسرے خدام اور اَحقر کے مدعو کیا، اور اس سے دُوسرے دن ایک تاجرِ چاول مقیم سہارن پور نے ہم سب کی مع بعض مہمانانِ مقیمین دعوت کی۔ مولاناؒ نے وعدہ فرمالیا کہ گاؤں سے صبح کو واپس آکر دوپہر کا کھانا تمہارے یہاں کھالیں گے۔ شام کو گاؤں گئے اور شب کو وہاں مقیم رہے، پھر صبح کو عین ایسے وقت کہ خوب زور سے بارش ہورہی تھی، اسٹیشن پٹری پر سوار ہوئے۔ اہلِ موضع ایسے وقت کے سفر کو گوارا نہ کرتے تھے اور قیام پر مصر تھے، لیکن چوں کہ ان سوداگر صاحب سے وعدہ تھا، اس لیے بھیگتے ہوئے ریل پر پہنچے اور سہارن پور اُترے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مدرسے کو آرہے تھے کہ راستے میں وہ سوداگر صاحب ملے، مولاناؒ نے

گاڑی ٹھہرا کر یا آہستہ کرا کر (یاد نہیں) ان کو اپنی واپسی کی اطلاع کی کہ ہم لوگ اپنے وعدے پر آ گئے ہیں، تو آپ کیا مزے کا جواب دیتے ہیں کہ ”مجھ کو اُمید واپسی کی نہ تھی، اس لیے میں نے کچھ سامان نہیں کیا، اب کل صبح کی دعوت ہے۔“

اس وقت مولاناؒ کا حلم اور میرا غصہ دیکھنے کے قابل تھا، مگر بہ وجہ ادب کے غصہ ظاہر نہ کر سکتا تھا، اور مولاناؒ نے منظور فرما لیا اور کھڑے چڑھے سب مہمانوں کے کھانے کا اِنتظام فرمانا پڑا۔

اگلے دن کی دعوت سے میں نے عذر کر دیا، جس کی اصل وجہ تو غصہ تھا، مگر ظاہری عذر یہ کیا کہ سویرے بھوک نہیں لگتی اور دیر میں ریل نہ ملے گی اور مجھ کو کل وطن جانا ضروری ہے۔ مولاناؒ نے سفارش فرمائی کہ دعوت میں شریک ہو جانا، اگر رغبت ہوئی کچھ کھا لینا، ورنہ اِصرار نہ ہوگا۔ چناں چہ اگلے روز سب حضرات ان کے مکان پر پہنچے اور کھانا لایا گیا، میں بھی بیٹھا رہا، مگر کھانے کی خواہش نہیں ہوئی، کچھ تو غصّے کے سبب کچھ خلافِ معمول ہونے کے سبب۔ تھوڑی دیر میں اجازت لے کر مکان سے باہر آیا اور صاحبِ دعوت کو بھی فرمایش کر کے ہم راہ لایا اور باہر آ کر ان کی اس نامعقول حرکت پر اچھی طرح کان کھولے اور توبہ کرائی۔

ف: اس سے مولاناؒ کا حلم ظاہر ہے، اور حلم بھی اتنے درجے کا کہ میں اس میں ساتھ نہیں دے سکا۔

اختلاف کے ضرر سے محفوظ رہا:

جام نمبر ۱۸: احقر کو بعض اُمورِ اِجتہادیہ ذوقیہ متعلقہ معاشرت وانتظام میں رائے کا اِختلاف تھا (ص ۱۴)، اور اس اختلاف کے ہوتے ہوئے میرا یہ خیال تھا کہ مجھ کو مولاناؒ سے صرف اِعتقادِ عقلی ہو سکتا ہے، انجذابِ طبعی نہ ہوگا، مگر کیفیت

یہ تھی کہ حاضری تو حاضری تصوّر کرنے سے اس قدر انجذاب ہوتا تھا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا، اور غالباً اسی کا اثر ہوگا کہ خواب میں بھی اگر کبھی زیارت ہوتی تو اسی شان سے ہوتی۔ یہ کھلی دلیل ہے محبوبیت کی کہ محبّ کو گمان بھی نہیں بلکہ اِحتمال عدم کا ہے، مگر طبیعت ہے کہ کھنچی چلی جاتی ہے، اور میں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت اپنے اُوپر سمجھتا ہوں کہ اس اختلاف کے ضرر سے مجھ کو محفوظ رکھا۔

جام نمبر ۱۹: احقر نے جو عقدِ ثانی کیا، اس کے دوران میں یا بعد میں (یاد نہیں رہا) بعض ثقات سے معلوم ہوا کہ مولاناؒ کی نظر میں پہلے ہی سے اس کا اِستحسان تھا اور رائے بھی ظاہر فرمائی تھی، مگر غالباً یہ خیال تھا کہ احقر منکوحۂ اُولیٰ کے سبب اس کی ہمت نہ کرے۔ جب اس کا وقوع ہوگیا بہت مسرّت ظاہر فرمائی، اور میری اس درخواست کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجیے کہ اس میں برکت فرمائے، یہ فرمایا کہ

"ہم کو تو برکات کی توقع ہے۔" (کمافی اصلاح الانقلاب (ص ۱۵)

ف: اس سے مولاناؒ کا تعلق نیازمندوں کی مصالحِ ظاہرہ وباطنہ سے ظاہر ہے۔ یہ شان فیوض مقامِ نبوّت سے ہے، ورنہ مقامِ ولایت کے فیض کی شان دُوسری ہوتی ہے کہ کسی مصلحت میں دخل نہ دیا جائے، اور اوّل کا اکمل ہونا معروف ہے۔

شانِ غلبۂ فقۂ ظاہر:

جام نمبر ۲۰: اور اس جام میں دُوسرے نوع جام کی طرف بھی اشارہ ہے، جو اس شعر میں مذکور ہے:

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

یعنی اس میں وفات کے بعد برزخ کا ایک واقعہ مذکور ہے، گوظنی ہے، لیکن مبشرات میں سے ہونے کے سبب قابلِ ذِکر ہے، اور یہ ایک ثقہ کا خواب ہے، جن کا نام محمد عمر فاروق مقیم غازی پور زیر قلعہ کہنہ ہے۔ ان کا خط ۱۳/رجب ۱۳۴۶ھ (۶/جنوری ۱۹۲۸ء) کو میرے پاس آیا، جو بعینہٖ منقول ہے اور اسی پر اس عجالے کو ختم کرتا ہوں، وھو ھٰذا:

"حال میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی بھی زیارت سے شرف یاب ہوا ہوں۔ مولانا مرحوم کو خواب میں بہت ہی خوش دیکھا۔ احقر نے عرض کیا کہ آپ تو زِندہ ہیں، لوگوں نے ناحق وفات کی خبر اُڑادی؟ اس پر مولاناؒ نے ہنس کر فرمایا: میں تو زِندہ ہوں۔ پھر یہ دیکھا کہ مولاناؒ کسی طالبِ علم کو 'مالابدمنہ' پڑھانا چاہتے ہیں"۔

ف: تعبیر ظاہر ہے، یہ ارشاد کہ میں تو زِندہ ہوں، مصداق ہے اس قول کا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور "مالابدمنہ" پڑھنا اِشارہ ہے مولاناؒ کے جامع بین الفقہ الظاہر والفقہ الباطن کی طرف، کیوں کہ "مالابدمنہ" کے مصنف دونوں کے جامع ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اشارہ ہے شان غلبۂ فقہ ظاہر کی طرف، چناں چہ "مالا بدمنہ" میں غالب حصہ یہی ہے۔ واللہ اعلم!

وھٰذا آخر ما اردت إیرادہ فی ھٰذا الحین، نفع اللہ بہ الطّالبین ورزقنا حبّہ وحُبّ نبیّہ وحُبّ الصّالحین، فقط!

اوائل ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ،
(مئی ۱۹۲۸ء) مقام تھانہ بھون

ضمیمہ خوانِ خلیل

یہ ضمیمہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کے مبارک قلم سے ہے۔ اس میں صرف یہ تصرف کیا گیا ہے کہ حضرتؒ نے اشعار کے جو ترجمے دیئے تھے وہ متن کتاب کے حاشیے میں لکھ دیئے، اور جو اصل ضمیمہ تھا وہ یہاں ذیل میں ذکر کر دیا ہے۔ اصل متن میں ضمیمہ کے لیے ''ض'' بنا دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ نمبر بھی لکھ دیا گیا ہے۔ وہی نمبر یہاں ہے اور اس میں تفصیل ہے۔

(اعجاز)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

ض ۱، اعلیٰ حضرتؒ سے اجازتِ بیعت اور حضرت گنگوہیؒ کے دستخط:

حضرت سہارن پوری نوّر اللہ مرقدہٗ ۱۲۸۸ھ یا ۱۲۸۹ھ (۷۳-۱۸۷۲ء) میں حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے تھے، جیسا کہ خود حضرت سہارن پوریؒ کی تحریر ''مقدمہ اِکمال الشیم'' میں لکھا ہے، اور اس بیعت کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ اس کے بعد ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں جب کہ حضرت سہارن پوریؒ کا دُوسرا سفرِ حج تھا، حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اپنے پیر و مرشد اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ کو بہ طور سفارش کے یہ تحریر فرمایا کہ

"مولوی خلیل احمد حاضرِ خدمت ہوتے ہیں، حضرت ان کی حالت پر
مطلع ہوکر مسرور ہوں گے۔"

چناں چہ جب آپ حاضر ہوئے تو اعلیٰ حضرتؒ آپ کی باطنی کیفیت مشاہدہ فرما کر نہایت خوش ہوئے، اور جب آپ محرم ١٢٩٨ھ (دسمبر ١٨٨٠ء) میں واپس ہونے لگے تو چھاتی سے لگایا اور اپنی دستار مبارک اپنے سر سے اُتار کر حضرت سہارن پوریؒ کے سر پر رکھ دی، اور حضرت گنگوہیؒ کے نام مبارک باد کا خط اور حضرت سہارن پوریؒ کے نام کا خلافت نامہ مزین بہ مہر آپؒ کے حوالے فرما کر آپ کو رُخصت کیا۔ حضرتؒ نے اس شاہی عطیے کو ایک خاص اِحترام کے ساتھ قبول کیا اور دستارِ مبارک کو اسی بندش پر جو اعلیٰ حضرت کی باندھی ہوئی تھی، جگہ جگہ سوئی سے سی لیا کہ اس کے بل جدا نہ ہونے پائیں، اور جب ہندوستان پہنچ کر گنگوہ حاضر ہوئے تو اعلیٰ حضرتؒ کا والا نامہ پیش کر کے یہ دونوں عطیے بھی حضرت گنگوہیؒ کے سامنے رکھ دیے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ

"مبارک ہو، یہ تو اعلیٰ حضرت کا عطیہ ہے۔"

آپ نے عرض کیا کہ بندہ تو اس لائق نہیں، یہ حضور کی بندہ نوازی ہے، اور میرے لیے تو وہی مبارک ہے جو آں حضرت کی طرف سے عطا ہو۔ نیز یہ بھی عرض کیا کہ اجازت نامہ درحقیقت شہادت ہے کسی مسلمان کے ایمان کی، لہٰذا دو مقبول شہادتیں ثبت ہوں گی تو ہر شخص کی نفسی نفسی پکارنے کے وقت بارگاہِ خدا میں پیش کر سکوں گا۔

حضرت اِمامِ ربانیؒ آپ کے اس حسنِ ادب سے کہ اصل کمال یہی ہے، بہت خوش ہوئے، اور خلافت نامے پر دستخط فرما کر مع دستار آپؒ کے حوالے فرما دیا۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ٥٨)

ض ۲، اعلیٰ حضرتؒ سے بیعت کا واقعہ:

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ طالب علمی کے آخری دور ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں بہ حالت قیام دیو بند بہ ذریعہ خط شیخ العرب والعجم سیّد الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔ (تمہید تربیۃ السالک) حضرت تھانویؒ نے ''یادِ یاراں'' کے شروع ہی میں اس قصے کو خود تحریر فرمایا ہے:

''سب سے اوّل اس نااہل کو اس مرکز دایرۂ اِرشاد کی زیارت اس وقت ہوئی جب میں مدرسۂ دیو بند میں پڑھتا تھا، اور وہاں حضرتؒ اپنی تشریف آوری سے اہلِ مدرسہ واہلِ شہر کو گاہ گاہ مشرف فرمایا کرتے تھے۔ سن یاد نہیں رہا۔ دیکھنے سے میرے قلب میں جو عقیدت اور محبت پیدا ہوئی وہ میرے لیے باعث اس کی ہوئی کہ باوجود حقیقت وغایت بیعت کے نہ سمجھنے کے میں نے بیعت کی درخواست کی۔ چوں کہ طبیبِ حاذق کو مریض کی رائے کا اِتباع ضروری نہیں، بلکہ اگر ایسا کیا جائے تو مریض کے لیے مضر بھی ہے، اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا کہ 'جب تک علم سے فراغ نہ ہو جائے اس وقت تک ایسا خیال وسوسۂ شیطانی ہے۔' اس وقت میری سمجھ میں اس جواب کی حقیقت وعظمت اور حکمت مطلق نہ آئی، اور غلط فہمی سے اس کو دفع الوقتی پر محمول کیا... الخ۔''

آگے حضرتؒ نے اس کی مصالح بتلائی ہیں۔ اس واقعے کو حضرت تھانویؒ کی سوانح میں اور بھی مفصل لکھا ہے، جس کو مختصر نقل کراتا ہوں:

''چوں کہ بہ مصلحت اشاعت معارفِ اِمدادیہ حضرتؒ کا حضرت حاجی صاحبؒ سے تعلق بیعت روزِ اوّل ہی سے مقدر ہو چکا تھا۔ اس کا غیب سے سامان یہ ہوا کہ ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ دیو بند

تشریف لائے تو حضرتِ والاؒ بہ غرضِ مصافحہ دوڑے تو ان اینٹوں کی وجہ سے جو وہاں نو درہ کی تعمیر کی وجہ سے پڑی تھیں، حضرتؒ کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور گرنے ہی کو تھے کہ حضرت گنگوہیؒ نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا۔ حضرتِ والاؒ کو حضرت گنگوہیؒ کی زیارت ہوتے ہی اس قدر کشش اور عقیدت ہوئی کہ بیعت کی درخواست کی۔ مولاناؒ نے اس بنا پر بہ زمانۂ طالب علمی کہ شغلِ باطن مخل تحصیلِ علم ہوگا، اِنکار کر دیا۔ اس واقعے کے بعد قریب ہی جب مولانا گنگوہی ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں تیسرے حج کو تشریف لے جانے لگے تو حضرتؒ نے حاجی صاحبؒ کی خدمت میں اس مضمون کا عریضہ لکھ کر غالباً خود مولاناؒ ہی کے ہاتھ بھیجا: 'میں نے تو مولانا سے بیعت کے لیے عرض کیا تھا، انہوں نے انکار فرما دیا، آپ مولانا سے فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں۔'

لیکن حضرت حاجی صاحبؒ نے بجائے مولاناؒ سے سفارش فرمانے کے حضرتِ والاؒ کو خود ہی شرفِ بیعت سے غائبانہ مشرف فرمایا، اور اَب معلوم ہوا کہ مولاناؒ کے اِنکارِ بیعت میں یہ قدرتی سبب در پردہ کارفرما تھا کہ حضرتِ والاؒ حضرت حاجی صاحبؒ ہی کے حصے میں آنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہو چکے تھے''۔

اشرف السوانح (ج ۱ص ۱۶۶) میں اس واقعے کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے، جس کو دیکھنا ہو وہاں دیکھ لے۔

حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کے بعد حضرتؒ کے والد ماجد کو لکھا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لے کر آنا۔ چناں چہ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں حضرت حکیم الامتؒ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور حضرت حاجی صاحبؒ سے دست بہ دست بیعت ہوئے، اور پھر ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں تشریف آوری ہوئی،

حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت حکیم الامتؒ سے فرمایا کہ ''چھ مہینے میرے پاس رہ جاؤ۔'' مگر والد صاحب نے مفارقت گوارا نہ کی، اس پر حاجی صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ ''والد کی اِطاعت مقدم ہے، اب تو چلے جاؤ، پھر دیکھا جائے گا۔''

دس برس تک حضرت حکیم الامتؒ کو حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کا اِشتیاق بڑھتا ہی رہا اور خط و کتابت بھی اس درمیان میں ہوتی رہی، جو ''اشرف السوانح'' میں موجود ہے۔ بالآخر ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) میں حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں چھ ماہ قیام کرنے کی نیت سے روانہ ہوگئے، اور وہاں پہنچ کر حضرت حاجی صاحبؒ کی وہ شفقتیں اور خصوصی توجہات بڑھیں کہ دیکھنے والوں کو حسد ہوگیا۔ حضرت حکیم الامتؒ کے الفاظ ہیں:

> ''اِرادہ تو چھ ماہ قیام کا تھا، مگر لگائی بجھائی کرنے والوں اور حاسدوں نے یہ اندیشہ ہوا کہ ابھی تو میں مقبول ہوں، آیندہ کہیں یہ حاسدین حضرتؒ کو میری طرف سے مکدّر نہ کردیں، اس لیے ہفتہ عشرہ پہلے ہی روانہ ہوگیا۔''

اس دورانِ قیام میں حضرت حاجی صاحبؒ نے سرسیّد مرحوم کو ایک خط حضرت تھانویؒ سے لکھوایا، جس کے بھیجنے میں بعض خدام مانع ہوئے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے کئی دفعہ فرمایا کہ:

> ''اگر وہ خط بھیج دیا جاتا تو اُمید ہے کہ اصلاح ہوجاتی، مگر ہمارے دوستوں کی رائے نہ ہوئی۔''

یہ خط ''اصلاح الخیال'' کے آخر میں طبع ہوگیا ہے۔

ص ۳۳:

یہ واقعہ ''آپ بیتی'' نمبر ۴، ص ۴۷ پر حضرت تھانویؒ کے حالات کے ذیل

میں اس سیہ کار نے بھی لکھا ہے، کیوں کہ یہ سیہ کار بھی اس دعوت میں شریک تھا، اس میں بندے نے باسٹھ رکابیاں لکھی ہیں، اور اس دعوت کی کچھ مزید تفصیل بھی لکھی ہے۔ شرکائے طعام تو چار ہی تھے، حضرت سہارن پوری نور اللہ مرقدہٗ اور یہ سیہ کار اور خود حضرت تھانویؒ اور وہ رئیس تھانہ بھون جن کا اسم گرامی جب حضرت قدس سرہٗ نے نہیں لکھا، تو میں کیوں لکھوں؟

ص ۴، تصویر کا مسئلہ:

یہ محاکمہ تتمہ جلد رابع ''فتاویٰ اِمدادیہ'' کے آخر میں ص ۳۲۲ پر بہت تفصیل سے لکھا ہوا ہے۔ چار صفحات پر، ص ۳۲۲ سے مذکور ہے، جس میں زید وعمرو کے اقوال اور ان کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔ ابتدا اس مضمون سے ہے:

''محاکمہ متعلقہ مسئلۂ تصویر از مولانا خلیل احمد صاحبؒ:
کیا فرماتے ہیں علمائے دِین اس باب میں کہ زید وعمرو میں حسبِ ذیل مکاتبت ہوئی، اس میں حق کس کی تقریر ہے؟ اور اگر زید کی تقریر حق ہے تو عمرو کی اَخیر تقریر کا کیا جواب ہے؟ وجہ اس مکاتبت کی یہ ہوئی کہ عمرو نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پشت کی طرف سے فوٹو لینے میں جس میں چہرہ نہ آئے گنجایش معلوم ہوتی ہے، اور درمختار کی روایت ممحوة الوجه سے اس کا اِستدلال تھا، اس پر زید کی تقریر ہوئی، پھر اس پر آگے سلسلہ چلا''۔

آگے زید وعمرو کی طویل مکاتبت جو مسئلۂ فقہیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں کثرت سے عربی عبارتیں ہیں، مذکور ہے۔ ان سب کی یہاں ضرورت نہیں، اصل ''اِمدادُ الفتاویٰ'' میں جس کو دیکھنا ہو دیکھے۔ اس جگہ تو صرف ''خوانِ خلیل'' کی مناسبت سے حضرت سہارن پوریؒ کا محاکمہ نقل کرنا ہے، جس کی طرف حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے اس جام میں اِشارہ فرمایا ہے:

''الجواب: حامدًا و مصلیًا! بندۂ ناچیز بہ اعتبار اپنے علم وفہم کے اس قابل نہیں ہے کہ علمائے اعلام کے اختلاف کا فیصلہ کرسکے، مگر ہاں امتثالاً للامر الشریف اس مسئلے میں جو کچھ خیال میں آیا ہے، عرض کرتا ہے۔ روایاتِ فقہیہ کے دیکھنے سے یہ امر واضح ہے کہ عمل تصویر اور اقتنائے تصویر میں فقہا کے نزدیک فرق ہے۔ تصویر سازی کو مطلقاً حرام اور ناجایز تحریر فرماتے ہیں، اور اقتنائے تصویر کو مطلقاً ناجائز نہیں لکھتے، بلکہ بعد تغیرات جایز تحریر فرماتے ہیں۔ لہٰذا ان وجوہ سے زید کا قول حق معلوم ہوتا ہے کہ فوٹو لینے میں کسی جان دار کے خواہ وجہ کی طرف سے لیا جائے یا پشت کی طرف سے عدم جواز ہو، اگرچہ زید کی تعمیم مستبین الاعضاء ہو یا غیر مستبین الاعضاء۔ ان دونوں کی مساوات روایات سے مفہوم نہیں ہوتی، اور روایت ترمذی وابوداؤد جس کے الفاظ یہ ہیں:

'فمرّ بالتّمثال الذی علی باب البیت فیقطع فیصیر کھیئۃ الشجرۃ'

اس امر کے اُوپر دلالت کرتی ہے کہ بعد قطع رأس تصویر ذِی رُوح کی باقی نہیں رہتی بلکہ وہ کالشجرہ ہو جاتی ہے۔ حال آں کہ وہ تصویر ظاہراً حیوان ہی کی تصویر معلوم ہوتی ہے، اور مضاہاۃ بخلق اللہ جو علتِ حرمت ہے متحقق معلوم ہوتی ہے، اور نیز مخصوص رأس کا مختلف فیہ ہونا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب بعض اجزائے اصلیہ مفقود ہو گئے تو وہ تصویر ذِی رُوح کی تصویر نہ رہی۔ ردّ المحتار میں ہے:

'وفیہ اشعار بأنہ لا تکرہ صورۃ الرأس وفیہ خلاف کما فی اتخاذھا کذا فی المحیط۔'

معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہا نے ایسے جزء کا حکم کل کا قرار دیا ہے اور

ذِی رُوح قرار دے کر اس کو منع کیا ہے، اور بعض نے اس کو غیر ذِی رُوح قرار دِیا ہے اور جایز فرمایا ہے۔ بندے کے نزدیک ایسے اِختلاف کی صورت میں اس خلاف کو نزاعِ لفظی پر محمول کیا جاے، اور حرمت کا محل عام اس کو قرار دِیا جاے کہ جب قصداً کسی ذِی رُوح کی تصویر پشت کی جانب سے لی جاے تو بہ روئے اطلاقِ روایات ناجایز ہو، اور جب کہ تصویر کا لینا مقصود نہ ہو، مثلاً کسی مکان یا جنگل یا پہاڑ کی تصویر لینی مقصود ہے اور پشت کی جانب سے کسی انسان کی تصویر آ گئی، یا اس قدر صغیر ہے کہ جو قریب سے بھی بہ دُشواری فہم میں آتی ہے، گویا مقدار طیر سے بھی کم ہے تو ایسی صورت میں جایز کہہ دیا جاے تو بہ ظاہر کچھ مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

حررہٗ خلیل احمد عفی عنہ

ض ۵:

"بیان القرآن" کے حاشیے پر مختلف توجیہات کے بعد یہ عبارت ہے:

"والذی تحرر عندی فیه وفیما ورد من امثاله علی تقدیر ثبوت هذه الروایات ان هؤلاء رضی الله تعالی عنهم سمعوا القرائة التی اختاروها من رسول الله صلی الله علیه وعلی آله وسلم تسلیمًا، ولم یسمعوا القرائات الموجودة، ثم ان تلك القراءة نسخت ولم یبلغهم الخبر فداموا علیها وانکروا غیرها بمخالفة ظاهر القواعد وعدم سماعه کما کان ابو الدرداء یقرء والذکر والأنثیٰ وکانت عائشة تقرء خمس رضعات فاحفظ کذا افاد جامع

الفضائل العلمية والعملية مولانا خليل احمد انبیٹھوی دامت برکاتهم۔‘‘

ض ٦:

یہ ’’اِمدادُ الفتاویٰ‘‘ جلد چہارم طبع ہند کے ص ۲۲۷ سے ۲۳۶ تک ہے۔ علمی مسائل ہیں، جس کا جی چاہے اصل سے مراجعت کرلے۔ عنوان اس کا یہ ہے:

’’بعضے اَز تحریرات سیّدنا ومولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم کہ در جواب سوالات صاحب فتاویٰ صدور یافتہ بہ مناسبت مقام در آخر ملحق کردہ شد‘‘۔

پہلا مسئلہ بعض قراءات کے متعلق ہے، طویل مضمون ہے، اس کا خلاصہ جام نمبر ۷ کے اندر آچکا ہے۔ اس کے بعد حضرتؒ نے تحریر فرمایا کہ پہلی مکاتبت تو ختم ہوگئی، اب دُوسری مکاتبت شروع ہوتی ہے:

’’مخدومنا ومقتدانا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اتفاق سے ایک مبتدع کی کتاب میں بعض شبہات نظر سے متعلقہ بہ معجزہ گزرے، جن کے شافی کافی جواب کے لیے طبیعت جویاں ہے، اور اس غرض سے اس وقت تکلیف دیتا ہوں:

معجزات کے متعلق اور جھوٹا دعوائے نبوّت کرنے والے کے متعلق طویل مضمون ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ دو مسئلے فروع میں سے قابلِ تحقیق ہیں:

ایک یہ کہ مدرسے میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقائے عین کے ساتھ اِنتفاع کہاں ہے؟ اور اگر یہ مِلک معطی کا ہے تو اس کے

مر جانے کے بعد واپسی ورثہ کی طرف واجب ہے؟''

''(الجواب) عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہلِ مدرسہ مثل عمال بیت المال، معطیین اور آخذین کی طرف سے وکلا ہیں، لہٰذا اس میں نہ زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطیین واپس لے سکتے ہیں''۔

''(مکرّر سوال) حضرت مخدومنا! دام اللہ ظلال فیوضہم علینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

شفانامہ مزیل مرض ہوا، لیکن اساس شبہ ہنوز قطع نہیں ہوئی (اس کے بعد پہلا نمبر تو معجزات کے متعلق ہے، اور دُوسرا نمبر یہ ہے) عمال بیت المال منصوب من السلطان ہیں اور سلطان کی ولایت عامہ ہے، اس لیے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے، اور مقیس میں ولایتِ عامہ نہیں ہے، اس لیے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا؟ کیوں کہ نہ توکیل صریح ہے اور نہ دلالت ہے، اور مقیس علیہ میں دلالت ہے کہ سب اس کے زیرِ طاعت ہیں، اور وہ واجب الاطاعت ہے''۔

''(الجواب) سیّدی ادام اللہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بندے کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں: ایک حکومت، جس کا ثمرہ تنفیذِ حدود وقصاص ہے۔ دُوسرا اِنتظام حقوقِ عامہ۔ اَمرِ اَوّل میں کوئی اس کا قایم مقام نہیں ہوسکتا۔ اَمرِ ثانی میں اہلِ حل وعقد بہ وقتِ ضرورت قایم مقام ہوسکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اہلِ حل وعقد کی رائے ومشورے کے ساتھ نصبِ سلطان وابستہ ہے، جو بابِ اِنتظام سے ہے، لہٰذا مالی اِنتظام مدارس جو بہ رضائے مالک وطلبا ابقائے دِین کے لیے کیا گیا ہے بالا ولیٰ معتبر ہوگا۔ ذرا غور فرمائیں! اِنتظامِ

جمعہ کے لیے عامہ کا نصب اِمام معتبر ہونا ہی جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہوسکے۔

والسلام

خلیل احمد عفی عنہ

۵/رجب ۱۳۲۵ھ (۱۴/اگست ۱۹۰۷ء)''

فروع میں دُوسرا مسئلہ جس کا حوالہ اُوپر آیا تھا، عدّت کے متعلق تھا کہ اگر عورت خاوند یا اس کے اقربا پر زبان درازی کرے تو اس کی وجہ سے اس کو گھر سے نکالا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق بھی تحریرات بہت سی اصل کتاب ''اِمدادُ الفتاویٰ'' میں موجود ہیں۔ ایسے ہی نقودِ مدرسہ کے متعلق حضرت اقدس قطب عالم مولانا گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ سے بھی یہی سوال کسی نے کیا تھا، حضرت گنگوہیؒ نے اس کا جواب مرحمت فرمایا تھا، جس کا ذکر ''تذکرۃ الرشید'': ج ۱، ص ۱۶۴ پر ہے، عبارت اس کی یہ ہے:

> ''شبہ: مدرسے میں جو چندہ وغیرہ کا ریپہ آتا ہے وہ وقف ہے یا مملوک؟ اگر وقف ہے تو بقائے عین واجب ہے، اور صرف بالاستہلاک ناجایز، اور اگر مملوک ہے اور مہتمم صرف وکیل تو معطیٔ چندہ اگر مرجائے تو غربا اور ورثا کا حق ہے، اس کی تفتیش وکیل کو واجب ہے۔ زمانۂ شارع علیہ السلام وخلفا میں جو بیت المال تھا اس میں بھی یہی اِشکال جاری ہے، بہت سوچا مگر قواعدِ شرعیہ سے حل نہیں ہوا، اور مختلف چندوں کو خلط کرنا استہلاک ہونا چاہیے اور مستہلک ملک مستہلک ہوکر جو صرف کیا جائے اس کا تبرّع ہوگا اور مالکوں کا ضامن ہوگا۔ اگر یہ ہے تو اہلِ مدرسہ یا امینِ انجمن کو سخت دِقت ہے''۔
>
> (الجواب از حضرت قطبِ عالمؒ): ''مہتمم مدرسے کا قیم ونائب

وجملہ طلبا کا ہوتا ہے، جیسا امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شے کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبا کا قبضہ ہے، اس کے قبض سے مِلکِ معطی سے نکلا اور مِلک طلبا کا ہوگیا، اگر چہ وہ مجہول الکمیۃ والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے، پس بعد موتِ معطی کے مِلک ورثہ معطی کی اس میں نہیں ہوسکتی، اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ مِلک ورثۂ معطی کی ہوگی، اور نہ خود معطی کی مِلک رہے۔ واللہ اعلم!"

ض ۷، ایک مسجد کا مسئلہ:

یہ بھی بہت طویل خط وکتابت ہے، جو "ترجیح الراجح" حصۂ دوم کے ص ۱۸۲ سے شروع ہوکر ص ۱۹۰ تک آٹھ صفحے میں ہے، جس کی تمہید میں حضرت حکیم الامتؒ نے لکھا ہے:

"مسائلة أهل الخلة في مسئلة الظلة: بعد الحمد والصلوٰۃ اس احقر نے مسجد پیر محمد والی کی چار سہ دریوں کے سامنے ٹین کا سایہ بان ڈلوایا تھا، ان میں ایک سہ دری کے سایہ بان کے متعلق بعض اہلِ علم سے بہ طور تحقیق خط وکتابت ہوئی، اس کو اس غرض سے نقل کرتا ہوں کہ اہلِ علم سے اس باب میں مزید تحقیق کرلی جائے اور میرے قول وفعل کو حجت نہ سمجھا جائے۔ میں نے اپنی فہم کے موافق کہا ہے اور کیا ہے: وسميتها بما سميتها اشارة إلى الإسم السمي نواث الكابر نخبة الأكابر (۱)۔"

(۱) یہ لفظ مختلف رسالوں میں ایسے ہی ملا، مگر اس کو ہمارے مدرسے کے ناظم اور حضرت حکیم الامتؒ کے اجل خلفا میں سے حضرتِ اقدس مولانا اسعد اللہ صاحب نے "تراث اکابر" پڑھا ہے، اس کے معنی سلف کی میراث کے ہیں۔ (زکریا)

’’(مکتوبِ اوّل آں بزرگ) مکرم محترم سیّدی ادام اللہ تعالیٰ فیوضکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (ایک (۱) اور مضمون کے بعد) آپ کی سہ دری کے سایبان کے متعلق مجھ کو خلجان ہے، میں اس کو ناجائز سمجھ رہا ہوں اور آپ جائز۔ مولوی .... کی تقریر کچھ فہم میں نہیں آئی، اس لیے مکلّف خدمت ہوں کہ مفصل کیفیت اس کی تحریر فرمائیں کہ وہ جنوبی سہ دری داخلِ مسجد ہے یا خارجِ مسجد؟ اور مسجد کے ساتھ اس کی تعمیر ہے یا بعد میں تعمیر کی گئی؟ یا اس کا کوئی حصہ داخلِ مسجد ہے؟ بعد تفصیلی علم کے اگر خلجان رہا تو عرض کروں گا (پھر ایک اور مضمون ہے)۔ والسلام ۳۰/شوال ۱۳۳۱ھ (۲/اکتوبر ۱۹۱۳ء)‘‘

’’(معروض احقر بہ جواب مکتوبِ اوّل) (میرے پاس جو کاغذ ہے اس میں القاب وآداب نقل نہیں ہوئے۔) مولوی .... سے جو مضمون ذِکر کیا گیا تھا وہ مطول تھا، اس لیے بہ وجہ عدم انضباط کے ادا نہیں کر سکے۔ ملخص اس کا یہ ہے کہ یہ دیوار جس پر سایے بان رکھا گیا ہے، جزوِ مسجد ہے، اور سایے بان بھی بہ قصد مصلحتِ مسجد ڈالا گیا ہے‘‘...الخ۔

مکتوبِ دوم بہ جواب معروضِ بالا:

’’مکرم ومحترم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(بعد ایک مضمون کے) سایے بان مسجد کے متعلق جناب نے دو مقدمے تحریر فرمائے ...الخ۔

معروض احقر بہ جواب مکتوب دوم (بعد القاب وآداب کے) دیوار کو جو میں نے جزوِ مسجد لکھا تھا وہ اس بنا پر کہ وہ فرشِ مسجد پر بنی ہوئی ہے،

---

(۲) کذا فی الاصل۔ (زکریا)

جیسا کہ حدودِ متقابلہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، گو بعد میں بنائی گئی، چناں چہ ایک بار میں نے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں بھی یہی شبہ پیش کیا تھا''...الخ۔

''مکتوب سوم بہ جواب معروضِ مذکور۔ مکرم ومحترم مصدر مکارم دام فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامی موجب برکت ہوا، کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلے کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں؟ مبادا تکرار موجبِ بار ہو، بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ اور عرض کردوں، اس وقت مجھ کو دو اَمر عرض کرنے ہیں: ایک تو دِیوار کے متعلق کہ مسجد ہے یا نہیں؟ دُوسرے سائے بان کے متعلق''...الخ۔

''معروض احقر بہ جواب مکتوبِ سوم (بعد القاب وآداب) والا نامے نے مشرف فرمایا۔ اظہارِ حق کا تکرار حاشا وکلا کہ قلب پر بار ہو، اور بحمد اللہ مجھ کو تو عادت ہے کہ جب کسی امر کا حق ہونا واضح ہو جاتا ہے پھر اپنی رائے پر اِصرار نہیں ہوتا، سو اَب تک اسی کا اِنتظار ہے جو نہیں ہوا، اور مجھ کو بھی تکرار فی الجواب خلافِ ادب معلوم ہوتا ہے، مگر تحقیق نے اس پر جری کیا...الخ۔ والسلام خیر الختام ۱۲/ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ (۱۴/ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

تمت المکاتبت

تنبیہ: گو پھر اس معروض کا جواب نہیں آیا، مگر اس جواب نہ آنے کو حجت نہ سمجھا جائے، چوں کہ اس کا سبب کوئی عارض بھی ہوسکتا ہے، مثلاً وہی امر جو مکتوبِ سوم کے شروع میں مذکور ہے، اس لیے اب بھی ضرورت ہے کہ اس باب میں اہلِ علم سے مزید تحقیق کرلی جائے، جیسا تمہید میں عرض کیا گیا۔ فقط!

ض ۸، حکایات الشکایات:

''حکایات الشکایات'' حضرت حکیم الامتؒ کی ایک مستقل تالیف ہے، جو مستقل بھی چھپی ہے مگر وہ نہیں ملی، لیکن یہ مضمون الامداد بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ (اپریل ۱۹۱۸ء) سے شروع ہوا ہے، جس کی تمہید میں حضرت حکیم الامتؒ نے لکھا ہے:

''بعد حمد وصلوٰۃ کے یہ احقر عرض رسا ہے کہ ایک مدّت دراز سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بے جا اِعتراضوں کی بوچھاڑ ہے، جس میں سے اکثر کا سبب تعصب وتحزب ہے، جس کے جواب کی طرف احقر نے اس لیے کبھی التفات نہیں کیا کہ میں نے ان اِعتراضوں کو قابلِ اِلتفات نہیں سمجھا۔ نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا قاطعِ اِعتراضات نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ مطوّلِ کلام ہوجاتا ہے، تو وقت بھی ضایع ہوا اور غایت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کیے کہ اس کام کے لیے مجھ کو وقت بھی نہیں مل سکتا تھا۔ چوتھے میں نے جہاں تک دِل ٹٹولا ایسے اِعتراضوں کے جواب دینے میں نیت اچھی نہیں پائی۔ میں اہلِ خلوص کو تو کہتا نہیں مگر مجھ جیسے مغلوب النفس کی نیت تو زیادہ یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقدین کم ہوجائیں گے، شان میں فرق آجائے گا، جس کا حاصل اِرضائے عوام ہے، سوطبعاً مجھ کو اس مقصود یعنی اِرضائے عوام سے غیرت آتی ہے۔ باقی بعض محبین کی یہ توجیہ کہ اِعتراض سے عام مسلمانوں کو بدگمانی کا گناہ ہوتا ہے، تو جواب سے ان کا اس گناہ سے بچانا ہے۔ تأمّل کے بعد یہ توجیہ برائے گفتن ہی معلوم ہوئی ہے، کیوں کہ مسلمان دُوسرے

ہزاروں گناہوں میں مبتلا ہیں، ان سے بچانے کا اس قدر اِہتمام کیوں نہیں کیا جاتا؟ نیز دُوسرے علمائے حقانی سے اگر ایسی ہی بدگمانی ہوجائے اس کے رفع کرنے کا وہ اہتمام نہیں ہوتا جو اپنے نفس یا اپنے کسی معتقد فیہ کے لیے ہوتا ہے، بلکہ اس قدر تو کیا کچھ بھی نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات تو اگر ان بزرگوں سے کچھ چشمک ہوتی ہے تو نفس میں ایک گونہ سرور پایا جاتا ہے کہ اچھا ہوا ان کی ذرا رُسوائی تو ہوئی۔

تدین کا تو مقتضا یہ تھا کہ اگر اپنے یا اپنے اکابر کے کسی مخالف سے بھی کسی کو بے جا بدگمانی ہو تو اس کے رفع کے لیے بھی ویسا ہی اہتمام ہو جیسا اپنے یا اپنے اکابر کے لیے ہوا ہے۔ پھر اس توجیہ کو کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟ اور خیر! اگر اپنے کسی بزرگ کے لیے ایسا اہتمام کرے تو اس کو نصرتِ مظلوم میں بھی داخل کرسکتے ہیں جو کہ طاعت ہے، مگر اپنے نفس کے لیے ایسا کرنا تو کوئی طاعت بھی نہیں، گو جایز ہو، مگر ممکن ہے کہ کسی کو بعض جایز سے بھی طبعاً اِنقباض ہوتا ہو۔ چوں کہ احقر کو اس سے اِنقباض ہوتا ہے، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گویا عوام کی خوشامد ہورہی ہے کہ ہم سے ناراض مت ہونا۔ ہم کو بُرا مت سمجھنا۔ ہماری بُرائی تم سے غلط کہی گئی ہے۔ سو جہاں کوئی دُنیوی ضرورت ہو وہاں تو ایسا کرنا بھی مضائقہ نہیں، اور جہاں یہ بھی نہ ہو تو کیوں تعب میں پڑے؟ اور تقلیل منافع مالیہ یا فوت جاہ یہ کوئی معتد بہ ضرر نہیں جس کے لیے اتنا اِہتمام کیا جائے۔ یہ ہے میرا مذاق اس اَمر میں۔

پس ان وجوہ سے میں نے اس کا کبھی قصد نہیں کیا، اور نہ اپنے مخصوصین کو اس کی اجازت دی۔ ہاں! اگر کسی محض بے تعلق شخص نے

بدون مجھ سے مشورہ لیے ہوئے کبھی جواب دے دیا تو نفس کو سرور ضرور ہوا، مگر پوچھنے پر مشورہ بھی کسی کو نہیں دیا، لیکن آج کل بعضے نئے اِعتراضات سن کر خصوص رسائل الامداد بابت شہور اولیہ سن رواں کے مضامین کے متعلق، یا بعضے پُرانے اِعتراضوں کا اِعادہ سن کر قلب میں ایک نیا خیال یہ پیدا ہوا کہ ممکن ہے کہ بعض معتقدین وموافقین کو اب تک ان اِعتراضوں کا علم نہ ہو اور اس لیے وہ معتقد ہوں، اور اگر علم ہو جاتا تو معتقد نہ رہتے، تو گویا زمانۂ بقائے عقدیت تک وہ دھوکے میں رہے، اور مسلمانوں کو دھوکے سے بچانا ضروری ہے۔ جیسا کسی تاجر کے سودے میں کوئی کھوٹ ہو تو ظاہر کر دینا ضروری ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ چند ایسے اِعتراضات کو نقل کر کے اپنے نزدیک جو ان کی حقیقت ہے اس کو بھی لکھ دیا جاے، تا کہ دیکھنے والے دونوں کو دیکھ لیں، پھر جس کا جی چاہے احقر سے تعلق پیدا کرے یا رکھے، اور جس کا جی چاہے تعلق نہ کرے یا نہ رکھے۔

ضمناً یہ بھی مصلحت ذہن میں آئی کہ بعض لوگ واقعی طالبِ حق ہوتے ہیں اور اصل قصہ معلوم نہ ہونے یا اس کی حقیقت نہ سمجھنے سے تردّد میں پڑ جاتے ہیں، اور وہ خلوص کے ساتھ تردّد رفع کرنا چاہتے ہیں، ایسوں کا تردّد رَفع کرنا ہدایت کا ایک شعبہ ہے جو کہ طاعت ہے، سو ساتھ ساتھ یہ طاعت بھی ادا ہو جاے گی۔

پس اس عجالۂ مختصرہ میں ان مضامین کو اس ترتیب سے لکھا جاے گا کہ اوّل ایک وہ مضمون جو مبنیٰ ہے اِعتراض کا بہ عنوان 'حکایت' لکھوں گا، پھر معترض کے اِعتراض کو بہ عنوان 'شکایت' نقل کروں گا، پھر اپنے نزدیک جو اس کی حقیقتِ واقعیہ ہے بہ عنوان 'درایت' لکھ کر ختم کر دوں گا، اور بفضلہٖ تعالیٰ ان شبہات سے کوئی مفسدہ ہوا بھی نہیں۔

چناں چہ خطبے کے آخری نوٹ نمبر ا میں مذکور ہے، اور خود حاجت نہ ہونا بھی مسلّم نہیں۔ رَفع شبہات وتصحیحِ اعمال وعقائد اعظم حاجت ہے۔ مثلاً: حکایت متضمنہ خواب مندرجہ رسالۂ صفر حکایت سوم میں وجۂ حاجت نہایت ظاہر ہے کہ اگر کسی اہلِ حال کو ایسا امر پیش آئے تو وہ غلطی اِعتقاد یا پریشانی وتوہم مطرودیت سے بچا رہے، اس سے وہ شبہ بھی دفع ہو گیا جو بعض خیر خواہوں کو جواب نہ دینے کے متعلق واقع ہوا کہ اپنے سے رفع تہمت کرنا سنت بھی تو ہے، جیسا حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعۂ اِعتکاف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ وجۂ جواب ظاہر ہے کہ یہ سنت بھی اس امر میں ہے جو محلِ اشتباہ ہو، اور جب یہ نہیں تو اِحتمالات غیر ناشی عن دلیل کا کہاں تک انسداد کیا جائے؟

مجھ کو اس وقت اپنی تین حالتیں پیشِ نظر ہیں:

ایک محبین کی ملامت اور مخالفین کا اِعتراض۔

دُوسرے ان سب اِعتراضوں کو جن کو دُوسرا عیب جو مدتوں میں چھانٹتا از خود ایک جگہ جمع کر دینا۔

تیسرے اس جمع کرنے میں یہ نیت کہ جس کا جی چاہے تعلق رکھے، جس کا جی چاہے نہ رکھے۔

ان تینوں حالتوں پر تین شعر بے ساختہ ذہن میں آئے ہیں۔ اوّل کے متعلق مؤمن خان کا یہ شعر:ـ

دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

ثانی کے متعلق اسی غزل کا دُوسرا شعر:ـ

میں گلہ کرتا ہوں اپنا، تو نہ سن غیروں کی بات

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

ثالث کے متعلق غالب کا شعر بہ تصرفِ یسیر: ۔

ہاں وہ نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ

(سورۂ مؤمن: ۴۴)

قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ یَفْتَحُ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ ھُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ (سورۂ سبا:۲۶)

نوٹ-۱: ممکن ہے کہ ان مضامین کی تحریر یا تدوین میں کوئی عمل کسی مناسب رائے کے خلاف واقع ہو گیا ہو، مگر بحمد اللہ! دِین کے خلاف کچھ نہیں ہے۔ نیز ان مضامین سے جو کچھ تشویش عوام میں ہوئی اس کا حاصل مجھ کو سبّ و شتم کرنا تھا، بحمد اللہ! کسی مقصودِ دِینی میں کوئی اِختلاف واقع نہیں ہوا، سو اپنے سبّ و شتم کو بہ امیدِ عفوِ حق سب کو معاف کرتا ہوں۔

نوٹ-۲: بندے نے آیندہ کے لیے ایک کافی جماعت اہلِ علم و دیانت کی اس کام کے لیے مخصوص کر دی ہے کہ میری تمام تحریرات کو نظرِ تنقید سے دیکھ لیا کرے، جو ان کی رائے میں قابلِ اشاعت نہ ہوں ان کو یا حذف کر دیں یا ان پر نشان بنا دیں، تاکہ ان کو کوئی شایع نہ کرے۔ باقی اگر کوئی خاص مکتوب الیہ کسی خاص مضمون کا جواب بہ طور خود بدوں (بلا) یہاں کے علم کے شایع کر دے تو وہ اِختیار سے خارج ہے۔ اب اگر کوئی مضمون جو ناظرین کے نزدیک واہم ہو یہاں سے شایع ہو تو اس کے متعلق خط و کتابت بجائے میرے بہ نام 'جماعت انتخاب التالیفات بہ نشان تھانہ بھون' فرمانا مناسب ہے۔

نوٹ - ۳: جس طرح 'ترجیح الراجح' کا سلسلہ شبہات محتمل الصحت کے لیے جاری ہے، ایسا ہی اگر موقع ہوا تو شبہات غیر محتمل الصحت کے لیے اس 'حکایات الشکایات' کا بھی سلسلہ جاری رہنا محتمل ہے۔
والأمر كله بيد الله!
نوٹ - ۴: اس وقت ایسے شبہات چھ ہیں: تین مخالفین کی طرف سے، تین احباب کی طرف سے، جن میں دو اوسط کے مجھ پر زیادہ شاق ہوئے ہیں، جن کے شاق ہونے کی وجہ بروایت متعلقہ حکایت نمبر ۴ میں مرقوم ہے۔

کتبہ
اشرف علی تھانوی عفی عنہ
آخر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶ھ
(۱۳/مارچ ۱۹۱۸ء)

اس کے بعد جامِ مذکور میں حکایت نمبر ۴ کے متعلق ذِکر فرمایا ہے، وہ ''الامداد'' بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۶ھ (اپریل ۱۹۱۸ء) میں حسبِ ذیل مذکور ہے:

''حکایت نمبر ۴: ایک شخص کا خواب مع تعبیر جو بہ عنوان سوال وجواب ذیل میں منقول ہے:
سوال: ۱۴/جمادی الاخریٰ روز جمعہ بہ وقت شب خواب میں احقر نے حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ نے فرمایا کہ: شاہ ....صاحب، مولانا........صاحب شیخ کامل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے نام میں 'مولوی' کہہ کے سکوت فرمایا، بعد کو غالباً دو منٹ سکوت فرما کے لفظ 'صاحب' کہا، اور شاہ .... صاحب صاف فرما گئے، بیچ میں سکوت نہ کیا۔ نہ معلوم وجہِ سکوت کیا

ہے؟ جو کچھ تعبیر ہو مطلع فرمایا جائے۔

الجواب: عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم مضطجعًا فی بيته كاشفًا عن فخذَيه او ساقَيه فاستأذن ابوبكر فأذن له وهو علٰى تلك الحال، فتحدث، ثم استأذن عمر فأذن له وهو كذلك، فتحدث، ثم استأذن عثمان فجلس رسول الله صلى الله عليه وسلم وسوّى ثيابه ...إلى قوله... قال: انّ عثمان رجل حيي وانی خشيت إن أذنت له علٰى تلك الحالة ان لا يبلغ إلىّ فی حاجته۔ رواه مسلم (مشکوٰۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر صفتِ حیا ولحاظ کے غلبے سے آپ نے ان کے ساتھ برتاؤ کا لحاظ کیا، اور شیخینؓ کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ کیا، اور لفظ 'صاحب' ہمارے محاورے میں لحاظ کے موقع پر بولا جاتا ہے، سو جن صاحب کے نام کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ 'صاحب' فرمایا ہے ان میں اس 'شانِ عثمانی' کا غلبہ مشاہد ہے، اور جس کے نام کے ساتھ یہ لفظ فوراً نہیں فرمایا اس سے شیخینؓ کا سا برتاؤ کیا، اور پھر وقفے کے بعد 'صاحب' کا لفظ فرمانا یہ مخاطب کی رعایتِ مصلحت سے ہے کہ وہ خالی نام لینے سے بے وقعتی اس نام والے کی نہ کرے۔

آگے اللہ کو معلوم ہے کیا راز ہے؟ بہتر یہ ہوتا کہ کسی ایسے شخص سے تعبیر پوچھی جاتی جو خواب کے تعلق والوں سے علاحدہ ہوتا اور محقق بھی ہوتا۔ والسلام!

مکرر یہ ہے کہ محض اس خواب کی بنا پر کسی کے کمال وغیرہ کے معتقد نہ ہوں کہ خواب حجتِ شرعیہ نہیں ہے۔ حالتِ بے داری میں، جس کی حالت کو شریعت پر پورا منطبق دیکھیں اس کو کامل سمجھیں۔ والسلام

شکایت: ایک صاحب کا خط آیا جو کہ بعینہٖ محفوظ نہیں، مگر خلاصہ اس کا یہ تھا کہ اس کی یہ تعبیر نہیں، بلکہ ایک نام کے ساتھ لفظ صاحب فوراً نہ کہنا اس وجہ سے ہے کہ اس نام کا مسمّٰی ایک زمانے میں بعض مسائل میں اختلاف رکھتا تھا، اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ جو آخر جواب میں لکھا ہے: 'محض اس خواب کی بنا پر... الخ' اس میں صاحبِ تعبیر نے دُوسرے صاحب کی بزرگی پر حملہ کیا ہے۔ انتھی بخلاصتہ!

درایت: یہاں سے جو جواب گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہی تعبیر صحیح ہو جو آپ نے لکھی ہے، مجھ کو اپنی تعبیر پر، کہ تعبیر ظنی ہوتی ہے، اِصرار نہیں اور حملے کے مضمون کا حاشا وکلاّ میرے قلب میں وسوسہ بھی نہیں۔ ایک قاعدہ کلیہ شرعیہ نفع طالبین کے لیے لکھ دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے کام آے۔

اسی طرح ایک روایت مجھ کو ایک ثقہ دِل سوز سے بہ ایں الفاظ پہنچی:

'سنا ہے کہ 'الامداد' میں حضرت .... قدس سرہٗ کی نسبت بھی کچھ ابہامات طباعت ہو گئے ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ حضرتؒ کا دِل اِستخفاف کے خطرے سے بھی پاک ہے، مگر سنتا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین و منتسبین کو گرانی ہو رہی ہے، اور دُور دُور تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ میں نے تو خود 'الامداد' دیکھا نہیں، سنا ہے کہ حضرت اِمام غزالی علیہ الرحمہ کی 'کتاب الزہد' کا تذکرہ اور اس پر حضرت .... کا کوئی قول مذکور ہے۔ اسی طرح یہ سنا ہے کہ مولوی .... صاحب کا کوئی خط اور آپ کی طرف سے اس کا جواب

'الامداد' میں طبع ہوا ہے، اس کے عنوان میں کچھ ایسے الفاظ لکھے گئے ہیں جن سے مولانا .... صاحب مدظلہٗ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ انتہیٰ'۔

اور واقعی یہ شکایتیں جو اس حکایت میں ہیں، اسی طرح جو اس سے پہلی حکایت میں ہے، مجھ پر سب سے زیادہ اَشد واَشق اس لیے ہے کہ جس ذاتِ مقدسہ کے ساتھ غلامی کی نسبت کو اوّلاً بالذات اپنے ایمان کا مدار قطعاً، اور جن اکابر کے ساتھ محبت وعقیدت کو ثانیاً بالعرض اپنے کمالِ نجات میں مؤثر ظناً اِعتقاد رکھوں، نعوذ باللہ ان ہی کی شانِ مبارک میں مجھ کو گستاخ بتایا جاے، اور گستاخی بھی وہ جس کی مجھ کو خواب میں بھی ہوا نہ لگی ہو؟ حکایت (۱) سابقہ کی درایت تو اُوپر گزر چکی اور اس حکایت کی درایت کے لیے میری تقریرات وتحریرات کے غیر محدود وغیر معدود مضامین کافی ہیں۔ نمونے کے لیے بعض اقل قلیل کا پتا عرض کرتا ہوں، ملاحظہ ہو: الظہور: ص ۴۵، اور رسالہ 'یادِ یاراں' تمام اور 'الامداد' بابت صفر ۱۳۳۶ھ (دسمبر ۱۹۱۷ء) ص ۲۹، اور ص ۳۰، اور ص ۳۱۔ جس میں مذکورہ بالا مولوی صاحب کا بھی ایک کلام ضمناً مذکور ہے اور وعظ فوائد الصحبت در مجموعہ اشرف المواعظ کلاں (۲) حصہ اوّل مطبوعہ ساڈھورہ، ص ۵۴، اور

---

(۱) ''خوانِ خلیل'' میں یہ حکایت آگے آرہی ہے، اور حکایات الشکایات میں وہ پہلے آچکی ہے، اس لیے سابقاً فرمایا گیا۔ (زکریا)

(۲) یہ سلسلہ میرے والدِ محترم حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے شروع کیا تھا، ہر ماہ ایک سو ساٹھ صفحات کا مجموعہ حضرت حکیم الامتؒ کے مواعظ کا شایع فرماتے تھے، اور قیمت صرف چار آنے تھی، جو اس کی پڑت سے بھی کم تھے، اور اس کے مستقل خریدار ماہوار رسالوں کی طرح سے سیکڑوں ہوگئے تھے، اور کلاں کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا تھا کہ اس نام کا ایک مختصر سا وعظ حضرت حکیم الامتؒ کا پہلے شایع ہو چکا تھا۔ (زکریا)

ص ۵۵، اور تنبیہات وصیت میں فہرست صالحین للبیعۃ اور مسودہ وعظ فضل العابد بیان کردہ ربیع الثانی جس میں شیخینؒ کبیرین مصداق یک ساں دونوں کی تفضیل بعض وجوہ سے حضرت شیخ العرب والعجم رحمۃ اللہ علیہ پر منصوص ہے۔

اگر تتبع کیا جائے تو بہ کثرت ایسے مقامات ملیں گے جن میں فضائل ان اجلہ کے مصرح ہیں۔ امام غزالیؒ کی کتاب الزہد کے متعلق جس مضمون کا مجھ پر شبہ کیا گیا ہے مجھ کو اوّلاً دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اے اللہ! یہ کیا قصہ ہے؟ میں نے اپنے ذہن میں اس کا کوئی وجود نہیں پایا، لیکن احتیاطاً اپنا کلام ٹٹولنا شروع کیا تو اتفاق سے وہ مقام مل گیا، دیکھا تو اس میں کسی بزرگ کا نام تک نہیں ہے، صرف لفظ 'ایک شیخ' لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کی تفسیر کس دلیل سے خود کر لی گئی ہے؟ میں نے بہت سوچا، بہت پرانی بات ہے، خوب محفوظ نہیں، لیکن دو اُمر پر حلف کرتا ہوں:

ایک یہ کہ میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مضمون نہیں سنا، کسی ایسے شخص سے سنا ہے جس کا مقصود اس قول سے اپنی کم ہمتی کے لیے ایک سہارا ڈھونڈ نا ہے، مگر مجھ کو اس شخص کی تعیین یاد نہیں رہی۔

دُوسرے اس پر حلف کرتا ہوں کہ مقصود اس سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر نکیر نہیں، باقی جس عنوان کا ذِکر اُس دِل سوز کے کلام میں ہے اس عنوان کے الفاظ مجاز یکے شیخ طریقت اونحوہ ہیں۔ سو اوّل تو یہ الفاظ معلوم نہیں کہ کس کے ہیں؟ لیکن جس کے بھی ہوں میرے ذہن میں جو اس کے معنی متبادر طور پر اوّلاً آئے وہ یہ ہیں کہ باوجود درجۂ مجازیت کے بھی انسان سے لغزش ہوسکتی ہے، تو اہلِ کمال کو بھی اپنی اصلاح سے غافل نہ ہونا چاہیے، تو مجازیت اس درجے کا عنوان ہے

کہ نعوذ باللہ ان شیخ کی تنقیص کہ ایسے کو کیوں مجاز بنایا؟ اس کی بہت سی نظیریں خود اپنے مجازین کے متعلق جا بجا تحریرات میں منضبط ہیں۔ چناں چہ اس وقت ایک موقع نظر کے سامنے بھی ہے۔ 'الامداد' بابت محرم ۱۳۳۶ھ (اکتوبر ۱۹۱۸ء) ص۲۱ کہ اس میں ایک صاحب پر جن کے مجاز ہونے کی عبارت میں بھی تصریح ہے، کس قدر لتاڑ پڑی ہے۔ اس مقام پر ظاہر ہے کہ یہی مقصود ہے کہ مجاز ہو کر بھی بے فکر نہ ہونا چاہیے کہ اس حالت میں بھی خطائیں صادر ہو سکتی ہیں۔

روایت: احقر نے اس درایت کے مضمون کا خلاصہ اپنی جماعت کے بعض حضرات اکابر کی خدمت میں (جو لباس خلۃ احمدیہ سے پیراستہ ہیں) عرض کیا تھا، اس کا جواب بہ خامۂ عنایت جو اِرشاد فرمایا اور اَصاغر کو جس کی توقع اکابر سے ہوتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے: معلوم نہیں لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہلِ خیر کے قلوب کو دُکھاتے ہیں (۱)۔ ہر چند کہ اس تحریر کے بعد بہ وجہ حصول طمانینت کے اس مضمونِ درایت کی حاجت نہ رہتی، خصوص اس کے بعد جب کہ بفضلہٖ تعالیٰ مشافہتاً بھی ہر پہلو سے اطمینان اور اِیقان حاصل وکامل ہو گیا، لیکن دو خیال سے اس کو باقی رکھا گیا:

ایک یہ کہ بہت قریب اِحتمال ہے کہ بعض کو اس درایت کے مضمون کا علم نہ ہونے سے کچھ وساوس باقی رہتے۔

دُوسرے یہ کہ اس کے ضمن میں میرا اِعتقاد جو اپنے اکابر کے ساتھ ہے اس کا علم میرے تمام متعلقین کو بھی صریحاً مقصوداً ہو جاوے، تاکہ مرورِ زمانہ پر بھی ان میں اس کا تغیر محتمل نہ رہے۔ فقط!''

(۱) یہ خط بعینہٖ ''خوانِ خلیل'' میں آ چکا ہے، اس لیے خلاصہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ (زکریا)

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ''الامداد'' محرم ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) صفحہ ۲۱ کا جو حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

''ملفوظات نمبر ۲۲: ایک صاحب نے جو مولوی اور مجاز تھے، ایک عریضہ لکھ کر خدمتِ والا میں پیش کیا، جس میں یہ مضمون تھا کہ میں اپنے وطن جاتا ہوں اور وہاں فتنے بہت ہیں، آپ کچھ فرما دیجیے تا کہ مجھے اطمینان ہو جائے۔ فرمایا کہ میں کیا کہہ دوں؟ ان صاحب نے اس کا جواب دینے میں گنجلک کی، آپ نے فرمایا کہ صاف جواب دو، اس تحریر کا کیا مقصود ہے؟ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا کہ کوئی ایسا لفظ کہہ دیجیے کہ حق تعالیٰ مددگار رہیں۔ فرمایا کہ یہ تو ایسا امر ہے کہ میں اس کے دریافت کرنے میں آپ کا حاجت مند ہوا اور آپ میرے کہنے سے پہلے اس کو جانتے ہیں، پھر مجھ سے یہ لفظ کیوں کہلایا جاتا ہے؟ پھر فرمایا کہ میرے سامنے سے دُور ہو جاؤ، تم کو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا، اگر دُعا کرانی تھی تو صاف لفظوں میں کہا ہوتا کہ دُعا کر دیجیے۔ (اس کے بعد ایک صاحب نے ان صاحب کی سفارش کرنی شروع کی تو ان پر بھی لتاڑ پڑی، 'الامداد' میں مفصل موجود ہے)''۔

اور اس درایت کے درمیان میں 'الامداد' بابت صفر ۱۳۳۶ھ (نومبر ۱۹۱۸ء) صفحہ ۲۹، ۳۰، ۳۱ کا جو حوالہ دیا تھا اس میں حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی نوّر اللہ مرقدہما کے تین قصے تفصیل سے ذِکر فرمائے ہیں:

اوّل قصہ اس مسئلے میں ہے کہ مجھے اس میں تردّد تھا کہ جمعہ کے بارے میں فقہا نے قصبے کو مصر کے حکم میں کیسے قرار دیا؟ جب کہ حدیث میں صرف ''مصر'' کا لفظ ہے اور قصبہ شہر ہے نہیں، پھر لفظ ''مصر'' قصبے کو کیسے شامل ہوا؟ سو یہ تردّد ایک

حکایت سن کر رفع ہوا، وہ یہ کہ حضرت گنگوہی نوّر اللہ مرقدہ ایک مرتبہ ایامِ طالب علمی میں گنگوہ کو آتے ہوئے قصبہ تیتروں کے برابر پہنچے تو کسی عامی سے پوچھا کہ یہ گاؤں کون سا ہے؟ وہ گنوار بولا: ''ارے تو کون ہے؟ شہر کو گاؤں کہتا ہے؟'' اس سے معلوم ہوا کہ شہر غیرِ گاؤں کو کہتے ہیں، اور لغت میں قصبے کا کوئی جدا نام نہیں، اس میں دو ہی لغت مستعمل ہیں: ایک قریہ اور ایک مصر۔ مجھے یہ روایت پہنچی کہ حضرت گنگوہیؒ کو بھی یہی تردّد تھا، مگر جب حضرتؒ ایک قصبے میں پہنچے جہاں لوگ آپ کو پہچانتے نہ تھے وہاں آپ نے دریافت کیا کہ یہ کون سا گاؤں ہے؟ جواب ملا کہ ''تجھے سوجھتا نہیں، یہ تو شہر ہے۔'' اس وقت حضرتؒ کو بھی شفائے قلب ہوگئی کہ عوام قصبے کو بھی شہر کہتے ہیں۔

دُوسرا واقعہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا لکھا ہے کہ اپنے صاحب زادے کے کپڑے، کی گٹھڑی منگا کر دیکھی تو اس میں کپڑے کسی قدر تکلف کے تھے اور گٹھڑی جام دانی کی تھی، حضرتؒ ان کو دیکھ کر بہت نفرت کے ساتھ سب کو پھینک رہے تھے اور زجر فرماتے تھے۔ حضرتؒ بہت بڑے زاہد تھے۔

اس کے بعد تیسرا واقعہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا یہ تحریر فرمایا کہ گنگوہ میں خانقاہ کی مسجد کو لوگوں نے تیار کرنا چاہا، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے لوگوں سے صاف کہہ دیا کہ بھائی! میرے بھروسے کوئی کام نہ کرنا کہ میں چندہ وصول کرانے میں سعی کروں گا (طویل قصہ ہے)۔

ض ۹، ایک خواب اور اس کا جواب:

''حکایت نمبر ۳: ایک صالح ذِی علم نے اپنی حالتِ باطنیہ لکھی تھی، یہاں سے اس کی تحقیق کی گئی تھی، وہ ذیل میں منقول ہے:

سوال: اب وجہ اس کی عرض کرتا ہوں کہ بیعت ہونے کا خیال مجھ کو

کیوں ہوا؟ اور حضور کی طرف کیوں رُجوع کیا؟ بیعت کا شوق صرف مطالعۂ کتبِ تصوّف سے اور حضور کی جانب رُجوع اس لیے کہ ہمارے ناناصاحبان .... لودھیانہ والوں سے حضور کے اِعتقادات ملتے جلتے تھے۔ اس سے یہ غرض نہیں کہ ہمارے نانا اور کوئی اپنے دادا وغیرہ علما کے اِعتقادات گو خراب ہی ہوں، ان کو بلاوجہ ترجیح دی جائے، اصل غرض یہ ہے کہ حضور کے اور بندے کے اِعتقادات بالکل ایک ہیں، اور اگر مولوی صاحبان لودھیانوی اور حضور کے درمیان کسی فروعات میں اختلاف بھی ہو تو اس میں بھی جناب کی طرف رُجوع کرتا ہوں۔

۲- اور حضور کی تصنیف چند کتابیں زیرِ مطالعہ رہی ہیں، جن میں سے ''بہشتی زیور'' تو حرزِ جان ہے........

کچھ عرصے کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھتا ہوں، لیکن مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی جگہ ....کا نام لیتا ہوں، اتنے میں دِل کے اندر خیال پیدا ہوا کہ تجھ سے غلطی ہوئی، کلمہ شریف کے پڑھنے میں، اس کو صحیح پڑھنا چاہیے، اس خیال سے دوبارہ کلمہ شریف پڑھتا ہوں، دِل پر تو یہ ہے کہ صحیح پڑھا جائے لیکن زبان سے بے ساختہ بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ....نکل جاتا ہے، حال آں کہ مجھ کو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح دُرست نہیں، لیکن بے اِختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے۔ دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں، اور بھی چند شخص حضور کے پاس تھے، لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہوگئی کہ کھڑا کھڑا بہ وجہ اس کے کہ رقت طاری ہوگئی، زمین پر گر گیا، اور نہایت زور سے ایک چیخ ماری، اور مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ

میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں رہی، اتنے میں بندہ خواب سے بے دار ہوگیا، لیکن بدن میں بہ دستور بے حسی تھی، اور وہ اثر ناطاقتی بہ دستور تھا، لیکن حالتِ خواب اور بے داری میں حضور کا خیال تھا، لیکن حالتِ بے داری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا اِرادہ ہوا کہ اس خیال کو دِل سے دُور کیا جائے، اس واسطے کہ پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے۔ بہ ایں خیال بندہ بیٹھ گیا اور پھر دُوسری کروَٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دُرود شریف پڑھتا ہوں، لیکن پھر بھی یہی کہتا ہوں: 'اللّٰھم صل علٰی سیّدنا ونبیّنا ومولانا ....' حال آں کہ اب بے دار ہوں، خواب نہیں، لیکن بے اِختیار ہوں، مجبور ہوں، زبان اپنے قابو میں نہیں، اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا تو دُوسرے روز بے داری میں رقت رہی، خوب رویا، اور بھی بہت سے وجوہات ہیں جو حضور کے ساتھ باعثِ محبت ہیں، کہاں تک عرض کروں؟

جواب: اس واقعے میں تسلی تھی کہ جس کی طرف تم رُجوع کرتے ہو، وہ بعونہٖ تعالیٰ متبعِ سنت ہے۔ ۲۴رشوال ۱۳۳۵ھ (۱۳راگست ۱۹۱۷ء)

یہ خواب اور اس کا مفصل جواب ''الامداد'' ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں مذکور ہے۔

''شکایت مع درایت: اس واقعے کے متعلق اور اس پر جو میرا جواب ہے اس کے متعلق جو کچھ شورش برپا ہوئی، جس میں زیادہ حصہ بعض اخباروں نے لیا، اس کا حاصل پانچ الزام ہیں:

اوّل یہ کہ نعوذ باللہ مجیب نے دعوائے نبوّت کا کیا۔ استغفر اللہ، نعوذ

باللہ، لاحول ولاقوۃ اِلّا باللہ!

دُوسرے یہ کہ صاحبِ واقعہ پرزجروتوبیخ اور اس کو اِستغفار کا اُمر نہیں کیا، کیوں کہ یہ وسوسۂ شیطانی تھا، یا کم از کم یہ واقعہ طبیعت پر گراں کیوں نہیں ہوا؟

تیسرے یہ کہ جب یہ وسوسۂ شیطانی تھا تو اس کو حالتِ محمودہ کیوں سمجھا گیا؟ جیسا کہ اس کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے۔

چوتھے یہ کہ صاحبِ واقعہ کو تجدیدِ اِیمان وتجدیدِ نکاح کا حکم کیوں نہیں دیا؟

پانچ ویں یہ کہ اس تحریر کو شایع کیوں کیا گیا جس سے اتنا مفسدہ ہوا؟

اِلزامِ اوّل کا اِفترا اور بہتانِ عظیم ہونا اس قدر ظاہر ہے کہ بجز اس کے کہ اس آیتِ مبارکہ کی تلاوت کردُوں اور زیادہ جواب دیتے ہوئے بھی غیرت آتی ہے، آیت:

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾ (سورۂ احزاب)

کیوں کہ عبارتِ جواب میں اوّل سے آخر تک ایک لفظ بھی اس دعوے پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ جواب میں لفظ متبعِ سنت خود اِعتراف ہے کہ مجیب کو حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غلامی کی نسبت ہے، پس اس اِلزام والوں کے لیے آیتِ موصوفہ کی وعید ہی کافی ہے، مگر چوں کہ دُنیا میں ایسے بھی غبی ہیں کہ وہ اس سے زیادہ واضح جواب کے محتاج ہیں، اس لیے اتنا اور عرض کرتا ہوں کہ غور کرنا چاہیے کہ اگر یہی واقعہ اس زمانے کے مشہور مدعیِ نبوّت کے سامنے پیش ہوتا تو کیا وہ اس کا یہی جواب دیتا جو احقر نے دیا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ وہ تو یوں کہتا کہ تمہارا مجھ کو رسول نہ سمجھنا اور اس بنا پر ان

الفاظ کو غلط جان کر فکرِ تدارک کرنا تمہاری غلطی ہے، اور میں واقع میں رسول ہوں، اور یہ کہتا کہ اس سے بڑھ کر میری رسالت کی کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ تم باوجودے کہ میری رسالت کا اِقرار کرنا نہیں چاہتے، مگر خدا تعالیٰ تم سے جبراً اس کا اِقرار کراتا ہے۔

اب موازنہ کرکے بتایئے کہ احقر کے جواب میں نعوذ باللہ دعویٰ تو درکنار کہیں اس کا شبہ بھی ہے؟ حاشا وکلّا! اگر یہ قصداً اِفترا نہیں بلکہ بدفہمی ہے تو اگر اس کی کوئی بنا بھی ہے، جیسے بعض کا قول سنا گیا ہے کہ صاحبِ واقعہ کے اس مضمون کے نقل کرنے پر رَدّ نہ کرنا اس مضمون کی تقریر ہے تو موٹی بات ہے جب صاحبِ واقعہ خود ہی اس مضمون کے رَدّ و اِبطال کو بھی نقل کر رہا ہے تو پھر مجیب کو اس کی کیا حاجت رہی؟ تو مجیب کا سکوت فی الواقع اس صاحبِ واقعہ کے اس رَدّ و اِبطال کی تقریر ہے نہ کہ اس مضمون کی۔ پھر یہ بنا کیا چیز رہی؟ اور اگر بلا کسی بنا کے یہ بدفہمی ہے تو بس اس آیت کا مصداق ہے، آیت:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝۴۶

(سورۂ حج)

اللہ تعالیٰ فہم وتدین عطا فرمائے۔ غرض اس الزام کا منشا تو جہلِ محض یا عناد بحت ہے۔

رہے بقیہ اِلزامات! سو اَصل یہ ہے کہ اس واقعے کے دو جز ہیں: ایک خواب کا، ایک بے داری کا۔ سو ظاہر ہے کہ حصۂ خواب میں وہ بالیقین وبالاجماع مکلّف تو ہے نہیں، مگر تاہم اس میں فی نفسہٖ چند اِحتمال ہیں:

ایک یہ کہ یہ خواب گو صورتاً منکر وقبیح ہے، مگر نظر بر صلاحِ حال صاحبِ رُؤیا تعبیر اس کی اچھی ہو۔ چوں کہ صاحبِ رُؤیا کی حالت کو

تعبیر میں دخل ہوتا ہے۔ جیسا حدیث میں قصہ آیا ہے کہ حضرت اُمّ فضل رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خواب عرض کیا:

کان قطعة من جسدك قطعت ووضعت فی حجری

اور ساتھ ہی یہ عرض کیا تھا:

رایت حلما منكر اللّیلة

مگر آپ نے یہ فرمایا کہ:

رایت خیراً

اور پھر ایک اچھی تعبیر دِی۔ (مشکوٰۃ، باب مناقب اہل البیت: ص ۵۷۲)

حال آں کہ ظاہراً کیا بے ادبی کا واقعہ دیکھا۔

اور جیسا اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خواب دیکھا:

انه اتیٰ قبر رسول الله صلی الله علیه وسلم فنبشه، فأخبر اُستاذه وكان ابوحنیفة صبیًّا بالمكتب، فقال له اُستاذه: إن صدقت رُؤْیاك یا ولد فإنك تقتفی اثر رسول الله صلی الله علیه وسلم وتنبش عن شریعته۔ فكان كما عبّر الاُستاذ۔ (رسالہ تعبیر الرؤیا، کشوری: ص ۳۷)

اسی طرح علامہ خطیبؒ نے اپنی تاریخ میں بہ تغییر بعض الفاظ یہ واقعہ درج فرمایا ہے (من رسالة بعض الأحباب)۔ دیکھیے یہ خواب ظاہراً کیسا موحش تھا، لیکن تعبیر کیسی تسلی بخش بتلائی گئی۔

دُوسرا اِحتمال یہ ہے کہ یہ خواب شیطانی ہو اور اس کی تعبیر اچھی نہ ہو، سو احقر کا ذہن جواب لکھنے کے وقت اس اِحتمالِ اوّل کی طرف گیا، اور

گو میں صاحبِ واقعہ کو نہ پہچانتا ہوں، نہ جانتا ہوں، کیوں کہ نہ وہ میرا مرید ہے، نہ کچھ خط و کتابت یا تعلیم و تلقین کا کوئی تعلق مجھ کو یاد ہے، مگر بعض قرائنِ قصہ سے میرے قلب نے اس کے صلاح کی شہادت دی، جن میں بڑا قرینہ غلط کلمات کے نکلنے سے اس کا خواب میں بھی پریشان ہونا اور اس کے تدارک کی کوشش کرنا ہے، کیوں کہ خواب میں آدمی مکلّف نہیں ہوتا، مگر باوجود عدمِ تکلیف کی حالت میں ہونے کے اَمر و نہی کا ایسا اِہتمام ہونا بیّن دلیل ہے صاحبِ رُؤیا کے ایمانِ قوی و صلاح کی۔ پس اسی صلاح و تدین کی بنا پر میں نے اس کی ایک اچھی تعبیر لکھ دی، اور اس وقت وجہ مناسبت کا نہ لکھنا ایک تو اس لیے تھا کہ میں اس کو اپنے نزدیک خفی نہیں سمجھا، دُوسرے اس لیے کہ مخاطب میرے گمان میں صاحبِ علم یا صاحبِ فہم تھا، اس کی حاجت نہ سمجھی۔ تیسرے تعبیر کے ساتھ وجہ مناسبت لکھنا ضروری بھی نہیں، جیسا حکمِ شرعی کے ساتھ دلیل لکھنا ضروری نہیں، مگر اب تبرّعاً وجہ مناسبت بھی لکھتا ہوں، اور وہ یہ کہ بعض اوقات خواب میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دِل بھی گواہی دیتا ہے کہ حضور ہی ہیں، لیکن زیارت کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ شکل کسی اور شخص کی ہے، تو وہاں اہلِ تعبیر یہی کہتے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس شخص کے متبعِ سنت ہونے کی طرف، پس جس طرح یہاں بجائے شکلِ نبوی کے دُوسری شکل مرئی ہونے کی تعبیر اِتباع سے دی گئی، اسی طرح بجائے اسمِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دُوسرا اسم ملفوظ ہونے کی تعبیر اگر اس اِتباع سے دی جائے تو اس میں کیا محذورِ شرعی لازم آ گیا؟ نیز مناسبت کی تقریر علمی اِصطلاح کے موافق یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تشبیہ بلیغ میں اداۃ تشبیہ حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے ابو یوسفؒ

ابو حنیفہؒ، اور تعبیر کے لیے ادنا مناسبت بھی کافی ہے۔ باقی مجھ کو اس پر اِصرار نہیں، اگر یہ خواب شیطانی ہو، یا کسی مرضِ دماغی سے ناشی ہوا ہو اور اس کی یہ تعبیر نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے، لیکن غلط تعبیر دے دینا ایک وجدان کی غلطی ہوگی، جس پر کوئی اِلزام نہیں ہوسکتا۔

یہ تو کلام تھا حصۂ خواب کے متعلق، اب رہا حصہ بے داری کا، جس میں غلط کلمات نکل رہے ہیں، سو صاحبِ واقعہ تصریحاً کہتا ہے کہ میں بہ قصد تلافی کلماتِ خواب کے صحیح کلمات ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر بلا اس کے اِختیار اور قصد کے پھر بھی غلط ہی نکلتے ہیں، سو چوں کہ کوئی دلیلِ شرعی یا عقلی اس شخص کی تکذیب پر اور اس حالت کے اِمتناع پر قایم نہیں، گو کثیر الوقوع نہیں، لیکن اتنی قلیل بھی نہیں کہ عدیم النظیر کہا جائے۔ غرض جب ایسا ممکن ہے تو اس شخص کی اس جز میں بھی تصدیق کی جائے گی، پس اس کی تصدیق کی بنا پر اس میں بھی چند اِحتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ حالت بقیہ اثر ہو اس حالتِ خواب کا، گو دونوں میں یہ تفاوت ہوگا کہ حالتِ خواب میں شعور و اِختیار دونوں منفی ہوتے ہیں، اور اس بے داری میں صرف اِختیار منفی ہو شعور منفی نہ ہو۔ جیسا بعض اوقات آدمی کچھ ہذیان بکتا ہے اور بے دار ہو کر بھی تھوڑی دیر تک ایسا مغلوب رہتا ہے کہ وہی بکتا رہتا ہے، اور مدار اِنتفائے تکلیف کا عدم اِختیار پر ہے، اگرچہ بقائے شعور کے ساتھ ہو۔ دُوسرا اِحتمال یہ ہے کہ اس پر کسی کیفیتِ باطنیہ کا غلبہ ہو، سو واقعی اس کا مضمون پڑھ کر جو میرے قلب پر اَثر ہوا اس اثر سے میرا وجدان انہی دو اِحتمالوں کی طرف علیٰ سبیل الترددّ گیا، اور دونوں اِحتمالوں پر ایسی حالت مثل خواب کے قابلِ تعبیر و تاویل ہوتی ہے، اس لیے میں نے اپنے جواب کو اس حالت کی بھی تعبیر مشترک قرار

دیا۔ باقی مجھ کو اس پر بھی اِصرار نہیں، کیوں کہ اس میں تیسرا، چوتھا اِحتمال اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس حالت کا سبب کوئی آفت دماغ یا لسان میں ہو، یا یہ کہ یہ شیطانی تصرف ہو کہ جس طرح وہ قلب میں وسوسہ ڈالتا ہے زبان پر ان کلمات کا اِلقا کر دیا ہو، لیکن ہر حال میں بہ تقدیر نفی اِختیار و قصد میں مصدق ہونے کے وہ نہ کافر ہے نہ عاصی ہے، بلکہ تیسرے اِحتمال پر تو یعنی جب کہ اس کا سبب کوئی آفت یا مرض ہو، یہ حالت مذموم و اثر شیطانی بھی نہیں، چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی فرح بالتوبہ کی مثال میں ایک شخص کی حکایت بیان فرمائی، جس نے شدّتِ فرح میں یہ کہہ دیا تھا:

اللّٰھمّ أنت عبدی وانا ربُّك

حال آں کہ فی نفسہٖ یہ کلمۂ کفر ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نقل فرما کر اس پر اِنکار نہیں فرمایا، بلکہ صرف اتنا فرمایا کہ

أخطأ من شدّة الفرح

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آفت فی اللسان کی حالت نہ مذموم ہے نہ اثرِ شیطانی ہے، اور نہ حق تعالیٰ کی فرحِ محمود کی تشبیہ فرحِ مذموم شیطانی کے ساتھ لازم آتی ہے۔ وھو باطل!

اور یہی حکم ہے آفت فی الدماغ کا، بل بالأولیٰ لأنہ مرض، وقال اللہ تعالیٰ: وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (سورۂ نور:۶۱)

اور اس حدیث مثالِ تائب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کلمۂ غیر صحیحہ پر ہر حالت میں گرانی ہونا ضروری نہیں، اور ایک اَعرابی نے جو آپ کے سامنے کہہ دیا تھا کہ ہم حق تعالیٰ کو آپ کے سامنے شفیع لاتے ہیں تو آپ پر بے حد گرانی ہوئی تھی، کیوں کہ وہ تکلم بالقصد تھا، گو جہل سے تھا، اور یہاں بلا قصد۔ فافہم!

اور واقعہ زیرِ بحث میں تو بلاقصد سے بھی زیادہ یعنی مع قصد واہتمام تکلم بکلمہ صحیحہ ایک غلط کلمہ نکلا تو وہ بہ درجۂ اَولیٰ عدم گرانی کا مستحق ہوگا، اور چوتھے اِحتمال پر گو یہ سبب عن الشیطان ہو، مگر معصیت پھر بھی نہیں، جیسا کہ قلب کے وسوسے کا حکم ہے، اور جامع دونوں میں عدم قصد وعدم اِعتقاد ہے، اور وسوسے کا یہ حکم یعنی عدمِ معصیت احادیث میں منصوص ہے، بلکہ باوجود وسوسے کے مذموم ہونے کے اس کے بلاقصد آنے کو علاماتِ اِیمان میں سے فرمایا گیا ہے۔ چناں چہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے: إنّا نجد في أنفسنا ما يتعاظم ...إلخ کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا: اوجدتموہ کے بعد ذاك صريح الإيمان ارشاد فرمانا (کمافی المشکوٰۃ عن مسلم: ص۱۸) صریح دلیل ہے اس کی، اور بعض احادیثِ وسوسہ میں جو اِستعاذہ کا اَمر فرمایا ہے، یہ دلیل نہیں اس کے معصیت ہونے کی۔ ہاں لفظ 'اِستغفار' سے اس دلالت کی گنجایش ہوسکتی تھی۔ چناں چہ معصیت نہ ہونا مجمع علیہ ہے اور یہ اِستعاذہ خواہ لفظاً ہو یا معنیً۔ چناں چہ بعض احادیث میں وہ مذکور بھی نہیں، صرف معنی پر اِکتفا فرمایا گیا، یعنی اس کو بُرا سمجھنا اور دفع کی کوشش کرنا، جیسا واقعہ زیرِ بحث میں بھی ایسا کرنا مذکور ہے۔ ونعم ما قال العارف الرُّومی: ؎

ترک استثنا مرادم قسوتے ست
نے ہمی گفتن کہ عارض حالتے ست
اے بسا ناوردہ استثنا بہ گفت
جان او با جان استثنا ست جفت

بہرحال تیسرے اور چوتھے اِحتمال میں بھی معصیت لازم نہیں، اور اگر تیسری حالت کے معصیت ہونے کا اس سے شبہ ہوجائے کہ

حدیث میں ہے:

من قال باللّات والعُزّٰی فلیقل: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ سبق لسان بھی اس درجے کی معصیت ہے کہ تجدیدِ ایمان کی ضرورت ہے، تو سمجھنا چاہیے یہاں ذِکر اس شخص کا ہے جس کو پہلے سے عادت کفر بکنے کی تھی، پھر بھی اس امر بالتدارک کا سبب خود اس سبق لسان کا فی نفسہٖ معصیت ہونا نہیں، بلکہ اس کے منشا یعنی عادتِ سابقہ اِختیاریہ کا مذموم ہونا ہے، اور تدارک جو اس کا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے کیا گیا ہے سو مقصود اس کا اِظہار بقائے ایمانِ سابق یعنی اظہار عدم زوال اِیمانِ سابق ہے نہ کہ احداث ایمانِ جدید بعد زوال السابق، سو اس سے وجوبِ تجدید پر بھی اِستدلال نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ کہ اس صاحبِ واقعہ کی تصدیق کی بنا پر متعدّد اِحتمالاتِ مذکورہ میں سے جو اِحتمال بھی لیا جاے ان سب میں اتنا تو مشترک ہے کہ یہ شخص نہ کافر ہوا نہ عاصی ۔پس اس سے اِلزامِ ثانی وثالث بھی مرتفع ہوگیا۔ ثانی تو اس لیے کہ یہ شخص جب نہ کافر ہے نہ عاصی تو پھر زجر وتوبیخ کی کیا وجہ؟ اور گرانی کا جواب اُوپر بہ ضمن تقریر حدیث مثالِ تائب ہوچکا ہے، ورنہ یہاں تو شب وروز مشاہد ہے کہ اس سے اہون اُمور پر گرانی وزجر تو کیا سخت سے سخت داروگیر کی جاتی ہے، تقریراً بھی تحریراً بھی، اور ثالث اس لیے کہ اتنے اِحتمالات کے ہوتے ہوئے اوّل تو یہی متیقن نہیں کہ یہ وسوسۂ شیطانی تھا، اور برتقدیر تسلیم بھی غایت مافی الباب میری ایک رائے کی غلطی ہوگی، مگر ملامت تو پھر بھی نہیں ہوسکتی۔

رہا چوتھا، پانچ واں الزام! سو اُوپر کی تقریر سے جب اس کا معذور عنداللہ ہونا ثابت ہوچکا تو واقعی جواب لکھنے کے وقت اس کی طرف

درجۂ وسوسہ تک میں بھی اِلتفات نہیں ہوا کہ آیا یہ ظاہراً احکامِ فقہیہ میں بھی معذور ہوگا یا کہ غیر معذور ہوکر مامور بہ تجدید الایمان یا بہ تجدید النکاح ہوگا، اس لیے میں نے اس کے حکمِ فقہی سے جواب میں تعرض نہیں کیا تھا، بلکہ جواب لکھنے کے مدتوں بعد تک بھی مجھ کو یہ اِحتمال نہیں ہوا کہ کوئی صاحبِ علم اس کو غیر معذور سمجھیں گے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ گو سب کی نہیں مگر بعض حضراتِ اکابر کی رائے اس کے ظاہراً وقضاً غیر معذور ہونے کی طرف ہے۔ اس وقت میں نے اس کے حکمِ فقہی کے اِظہار کی ضرورت سمجھی، اور چوں کہ اس معاملے کا بہ وجہ مجیب ہونے کے میرے ساتھ ایک گونہ تعلق تھا، اور میری رائے اس میں نرم تھی، اس لیے میں نے اپنے فتوے پر اِعتماد کرنے کو خلافِ احتیاط سمجھ کر دُوسرے حضرات سے فتاوے حاصل کیے، جن کا اس مقام پر تو (بہ وجہ کم گنجایش ہونے کے بدوں (بلا) اپنی رائے کو دخل دیے ہوئے) صرف خلاصہ بہ الفاظہا نقل کیے دیتا ہوں، بعد میں کسی موقع پر ان کو بعینہا مع ایک مفصل تحریر ایک صاحبِ علم(۱) کے مرتب کرکے اگر کوئی صاحب شایع کرنے کے لیے مانگیں گے، دے دیئے جائیں گے۔

پس ان میں سے سہارن پور کے فتوے کا حاصل یہ ہے کہ صاحبِ واقعہ کا حادثہ ذُوجہتین ہے، ایک جہت وہ ہے جس سے فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ اس کو مؤمن قرار دِیا جاتا ہے۔ دُوسری جہت ظاہر اطلاق کلمۃ الکفر کی ہے کہ جس پر اس کو مامور بہ تجدید الایمان والنکاح احتیاطاً کیا جاتا ہے، اس صورت میں فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ نکاحِ

(۱) ان صاحبِ علم کی تحریر بھی حضرت حکیم الامتؒ نے حسبِ وعدہ شایع کردی ہے، جو شوال ۱۳۳۶ھ (جولائی ۱۹۱۸ء) کے ''الامداد'' میں تریسٹھ صفحے میں ہیں۔ (زکریا)

اوّل بحالہٖ باقی ہے، لہٰذا اس کی زوجہ کو جایز نہیں ہے کہ وہ کسی دُوسرے شخص سے نکاح کرے یا تجدیدِ نکاح سے اِنکار کرے۔ انتہی!

اور دیوبند کے فتوے کا حاصل یہ ہے کہ اس کو معذور کہنے میں اور حکمِ کفر واِرتداد نہ کرنے میں کچھ تردّد نہیں ہے، اور جب کہ حکمِ کفر واِرتداد اس پر صحیح نہیں ہے تو حکمِ بینونتِ زوجہ بھی متفرّع نہ ہوگا، اِستحباباً تجدید کر لینا مبحث سے خارج ہے، لیکن ضروری کہنا خلافِ ظاہر ہے۔

اور اس دُوسرے فتوے کی ایک تصدیق کا حاصل یہ ہے کہ عدمِ تکفیر اس قائل کی بہ حسب بیان اس کے کہ بلا اِختیار اس سے یہ کلمہ صادر ہوا، دیانتاً متفق علیہ ہے۔ البتہ زوجہ اس کی اگر تصدیق نہ کرے تو غایت یہ کہ زوجہ اس کو حلف دے۔

اور دہلی کے فتوے کا حاصل یہ ہے کہ جب صاحبِ واقعہ نے اپنے اِختیار اور اِرادے سے الفاظِ مذکورہ نہیں کہے ہیں تو وہ بالاتفاق مرتد نہیں ہوا، اور چوں کہ ان الفاظ کا اس کی زبان سے صدور خطاً ہوا ہے، اور اس صورت میں اِتفاقاً کفر عائد نہیں ہوتا، اس لیے اس کو تجدیدِ نکاح یا تجدیدِ اِیمان کا حکم بھی نہیں کیا جائے گا، اِحتیاطاً تجدید کر لینا بحث سے خارج ہے۔ اس کی منکوحہ قطعاً اس کے نکاح میں ہے اور اسے ہرگز دُوسرا نکاح جایز نہیں۔ اگر اس کی یہ حالت بے خودی و بے اِختیاری معروف ہو جب تو حکمِ قضاء ودیانت میں کوئی فرق ہی نہیں، اور اگر یہ حالت معروف نہ ہو، تاہم بہ وجوہ مذکورہ بالا قضاءً بھی بلا قسم یا زیادہ سے زیادہ قسم کے ساتھ تصدیق کی جائے گی۔

انتہت!

اور اَصل مدعا میں یہ سب فتوے متحد ہیں، یعنی ۱- عدم حکم بالارتداد،

۲-بقائے نکاحِ زوجہ، ۳-عدم جواز نکاحِ زوجہ بالزوج الثانی، اور جو اُمور زاید علیٰ اصل المدعا ہیں، مثلاً امر بہ تجدیدِ نکاح و ایمان اِحتیاطاً ان میں گو نہ اِختلاف یہ معتد بہ اِختلاف نہیں، پس ان فتووں کے باہم متخالف ہونے کا شبہ نہ کیا جائے۔

اب میں اس باب میں علما کی تحقیقات کو (جن میں بعض میرے اس شخص کو معذور سمجھنے کی بنا پر حکمِ فقہی سے تعرض کے ضروری نہ جاننے کی من کل الوجوہ مؤید ہیں) ظاہر کر کے سبک دوش ہوتا ہوں۔ اب علما اپنی تحقیق سے اور عوام اپنے معتقد فیہ علما کی تقلید سے، اور اسی طرح صاحبِ واقعہ بھی ان فتووں کی تنقیح سے حکمِ فقہی معلوم فرمالیں۔

رہا پانچ واں اِلزام! سو واقعی میرے نزدیک یہ واقعہ اتنا ظاہر تھا کہ اس میں کسی ایسے شبہے کی گنجایش میرے ذہن میں نہ تھی، اور کسی شبہے کی گنجایش نہ ہونے ہی کے سبب میں نے جوابِ مجمل کو کافی سمجھا۔ تفصیل کی حاجت نہ سمجھی، تو اس حالت میں اس کی اشاعت میں کسی مفسدے کا اِحتمال کیوں کر ہوسکتا تھا؟ اور جب اس کا اِحتمال نہ تھا تو گو اِشاعت میں یہ فایدہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر کسی کو ایسی حالت پیش آئے تو وہ تلبیس سے محفوظ رہ کر اپنے جان و اِیمان کو بچا سکے، اور ایسا ہی شخص اس فایدے کی قدر بھی کرسکتا ہے، ورنہ غیر صاحبِ حال کیا جانے؟ بہ قول کسے:

اے ترا خارے بہ پا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

یہ تھی حقیقت واقعے کی راست راست بے کم و کاست! خلاصہ سب کا یہ ہے کہ بحمد اللہ نہ صاحبِ واقعہ نے اور نہ احقر نے نہ کسی کفر کا ارتکاب کیا نہ کسی معصیت کا۔ غایت مافی الباب بعض اُمور متعلق

رائے میں رائے کا اختلاف محتمل ہوسکتا ہے، جو کسی درجے میں بھی محلِ ملامت نہیں ہے، مگر پھر بھی صمیمِ قلب سے کہتا ہوں:

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا عَلِمْتُ مِنْہُ وَمَا لَمْ اَعْلَمْ، وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ، وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ''۔

ض ۱۰:

یہ مضمون ''الامداد'' شوال ۱۳۳۶ھ (جولائی ۱۹۱۸ء) کا حوالہ ہے، وہ ''الامداد'' مذکورہ کے صفحہ ۳ سے شروع ہوکر صفحہ ٦٦ پر ختم ہوا، جس میں فتوائے سہارن پور حضرت سہارن پوریؒ کی طرف سے، اور فتوائے دیوبند مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور فتویٰ دہلی مفتی کفایت اللہ صاحب کی طرف سے بہت تفصیلی ذِکر کیے گئے ہیں، اور بہت طویل بحث اس سلسلے میں کی گئی ہے۔ اس سب کو تو یہاں نقل کرانا بہت دُشوار ہے، جس کو دیکھنا ہو، اصل ''الامداد'' میں دیکھے۔ اس میں ایک دُوسرا خواب بھی ایک شخص کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت اور اس خواب کے متعلق حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے سوال، اور حضرت قدس سرہٗ کا جواب مع تفصیل وتعبیر نقل کیا گیا ہے، مضمون تو بہت اہم ہے، لیکن چوں کہ خاص اہلِ علم سے متعلق ہے اور طویل بھی بہت ہے کہ ساٹھ صفحے کا ہے، اس لیے یہاں نقل نہیں کیا گیا۔

ض ۱۱:

یہ وعظ مدرسۂ مظاہر علوم کے سالانہ جلسے، جامع مسجد میں بہ روز یک شنبہ (اتوار) ۱۰؍ جمادی الثانیہ ۱۳۳٦ھ (۲۳؍ مارچ ۱۹۱۸ء) میں ہوا، جو ڈھائی گھنٹے تک مسلسل ہوا، یہ وعظ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی حال شیخ الاسلام

پاکستان نے نقل کیا تھا، چار ہزار سے زاید مجمع تھا، وعظ تو چوالیس صفحے کا ہے، جس تمہید کا حضرت حکیم الامتؒ نے ''خوانِ خلیل'' میں ذِکر کیا ہے اس کو اس وعظ کے شروع میں مولانا ظفر احمد صاحب ناقلِ وعظ نے بھی ذِکر کیا ہے:

''تنبیہ: جس سال یہ وعظ جلسۂ مظاہر علوم سہارن پور میں ہوا ہے اس سال حضرت اقدس سیّدی حکیم الامت دامت برکاتہم پر ایک شخص کے خواب کی وجہ سے عوام کالانعام نے زبانِ طعن بہت کچھ دراز کر رکھی تھی۔ اخبارات میں بھی اس کا بہت کچھ شور وغوغا رہا اور یہ سنت اللہ ہے کہ قایم بالامر کے ساتھ اوّل اوّل بہت مخالفتیں عوام کی طرف سے ہوا کرتی ہیں، مگر آخر میں سب کو گردنیں جھکانا پڑتی ہیں۔ بہرحال جب جلسۂ مذکورہ میں حضرت حکیم الامت تشریف لے گئے اور آپ کا بیان ہونا قرار پایا تو بیان سے پہلے سیّدی ومرشدی حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم نے مولانا سے فرمایا کہ اس وقت بہت بڑا مجمع موجود ہے۔ اس کے بعد کی عبارت حضرت سہارن پوری کے اس ارشاد تک کہ 'جب آپ کو گوارا نہیں تو پھر کوئی ضرورت نہیں' کے بعد 'مظاہر الاقوال' کی تمہید میں یہ ہے:

'اس کے بعد حضرت حکیم الامت منبر پر تشریف لے گئے اور بیان شروع فرمایا تو بے ساختہ زبان پر وہ آیت آئی جو حضرت صدیقہؓ کی براءت میں حق تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے کہ ان کے متعلق بھی ایک اِفترا و بہتان منافقوں نے تراشا تھا، جس میں کچھ مسلمان بھی ملوّث ہوگئے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو جنہوں نے اس بہتان میں حصہ لیا تھا ان آیات میں سخت دھمکایا ہے۔ حضرت حکیم الامت نے اس آیت کو تلاوت فرما کر حفاظتِ لسان کی تاکید وضرورت بیان فرمائی۔ بعد بیان کے فرماتے تھے کہ میں نے تو حضرت مولانا خلیل

احمد صاحب کے ارشاد کو قبول نہ کیا تھا، مگر حق تعالیٰ نے مولانا کی خواہش پوری کردی کہ مولانا جو کچھ چاہتے تھے وہی بیان ہوگیا۔ یہ مولانا کی توجہ کا اثر تھا کہ میری زبان سے یہی مضمون بیان ہوا جس کی مولانا کے خیال میں ضرورت تھی''۔ (ظفر احمد)

اس کے بعد وعظ شروع ہوا، اور خطبہ مسنونہ کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی:

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۖ وَّ هُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝١٥ (سورۂ نور)

ض ۱۲، مولانا احمد صاحبؒ:

''ذِکرِ محمود'' جو ''النور'' جلد ۱، حصہ ۲، بابت ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۹ھ (فروری ۱۹۲۱ء) میں یہ واقعہ اس طرح نقل کیا گیا ہے:

''ذِکر نمبر ۲۴: حضرتؒ کے انصاف اور حق پرستی اور رعایتِ دین کا نمونہ ایک قصے سے واضح ہوتا ہے۔ ایک قصبے میں ایک رئیس اور عالم کے یہاں جو اپنے ہی مجمع کے ہیں، ایک تقریب تھی، احقر بھی اس میں مدعو تھا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی اور دیگر حضرات بھی، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رُسومِ بدعت میں سے کوئی رسم وہاں نہیں، اور کیوں کر ہوتی؟ جب کہ صاحبِ تقریب خود بدعت سے مانع تھے، مگر عام برادری کی دعوت تھی جس کو میں بنا بر تجربہ رُسومِ تفاخر میں سے سمجھتا ہوں، اور جن اکابر پر حسنِ ظن غالب ہے وہ اس میں توسع فرماتے ہیں۔ چناں چہ اسی تفاوت کا یہ اثر ہوا کہ میں تو بلا شرکت واپس آگیا اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔ خود اپنے ہی مجمع میں اس کا مختلف عنوانوں سے بڑا غوغا ہوا، اور مجھ سے تو جب اس اختلاف کے متعلق کسی نے سوال کیا میں نے تو بزرگوں کے ادب کی

رعایت ہی مدنظر رکھ کر جواب دیا، مگر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا (محمود حسن) رحمۃ اللہ علیہ سے بھی جو بعض نے سوال کیا تو باوجودے کہ حضرتؒ کے ذمے اس احقر کی رعایت کی کون (سی) ضرورت تھی، لیکن جو جواب عطا فرمایا اس میں جس درجے رعایت ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ جواب یہ تھا کہ واقعی بات یہ ہے کہ عوام کے مفاسد کی جس قدر فلاں شخص (یعنی احقر) کو اِطلاع ہے، ہم کو اِطلاع نہیں، اس لیے اس نے اِحتیاط کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ع

بریں نکتہ گر جاں فشانم رواست

یہ جواب مجھ سے بعض ثقات نے نقل کیا۔ فقط!''

(اَز زکریا عفی عنہ) ''النور'' میں یہ واقعہ اتنا ہی چھپا ہے، چوں کہ یہ سیاہ کار بھی اس تقریب میں شریک تھا اور اس سیہ کار کے سامنے ہی یہ شور وغوغا اور ہنگامہ برپا ہو رہا تھا، ایسے موقعوں پر عوام میں توچہ میگوئیاں خوب ہوا کرتی ہیں، اس لیے بعض نے تو شیخین پر اِعتراض کیا کہ حضرت تھانویؒ کے یہاں جتنی باریک بینی ہے بڑوں بڑوں کے یہاں بھی نہیں، اور بعض نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ ونوّر اللہ مرقدہٗ پر اِعتراضات کیے کہ اکابر کے ہوتے ہوئے بھی اپنے تقوے کا مظاہرہ کیا؟ یہ غسلِ ختنہ عزیزم مولوی حکیم طیب مرحوم رام پوری کا تھا، جن کے صاحب زادے الحاج مولوی حافظ عامر انصاری سلّمہٗ مقیم دہلی، مصنف رسالہ ''فضائل علم ومناقب علما'' وغیرہ ہیں، میں نے ان سے اس کی تاریخ پوچھی تھی، انہوں نے لکھا کہ

''والد مرحوم کے ختنے کی تاریخ جیسا کہ انہوں نے خود لکھائی تھی اور ان کی بیاض میں بھی موجود ہے، ۲۱ر ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ (۲۱ر اپریل ۱۹۱۱ء) کو ختنہ ہوئی اور ۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۹ھ (۴ر مئی

۱۹۱۱ء) کو تقریب صحتِ ختنہ ہوئی۔''

ان کے والد حضرت مولانا الحاج احمد صاحب قدس سرہٗ جن کے متعلق حضرت حکیم الامتؒ نے ''ذِکرِ محمود'' میں لکھا ہے کہ ''کوئی رسم کیوں کر ہوتی جب کہ صاحبِ تقریب خود ایک عالم بدعت سے مانع تھے؟'' حضرت قطبِ عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے حدیثِ پاک کے شاگرد تھے۔ اسی کے متعلق عزیزی مولوی عامر نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ

''۱۴/شوال ۱۳۰۳ھ (۱۶/جولائی ۱۸۸۶ء) کو دادا مرحوم بہ غرض تحصیلِ علم حدیث گنگوہ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور تعلیمی سال کے بعد ۱۷/شعبان ۱۳۰۴ھ (۱۱/مئی ۱۸۸۷ء) بعد تکمیل صحاحِ ستہ فارغ ہوئے۔ فقط!''

حضرت الحاج حافظ محمد ضامن صاحب تھانوی شہیدؒ کے اجل خلیفہ جناب الحاج حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوریؒ کے بھتیجے تھے، جس کی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ کے یہاں بھی خاص منظورِ نظر تھے، اور اس کی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ کے اجل خلفا سب ہی سے خصوصی تعلق تھا۔ اَخیر تک دار العلوم دیو بند کے ممبر اور مدرسۂ مظاہر علوم کے سر پرست رہے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے مشہور تحریک ریشمی خطوط کے خاص راز داروں اور مشیروں میں سے تھے۔ شوال ۱۳۳۳ھ (اگست ۱۹۱۵ء) میں جب حضرت شیخ الہند و حضرت سہارن پوری نور اللہ مرقدہما حجاز تشریف لے گئے، جس کی تفاصیل حضرت شیخ الہندؒ و حضرت سہارن پوریؒ کی سوانح میں مذکور ہے، روانگی سے قبل مظاہر علوم کے کتب خانے میں تقریباً ایک ہفتے تک حضرت شیخ الہندؒ و حضرت سہارن پوریؒ، اعلیٰ حضرت رائے پوریؒ شاہ عبد الرحیم صاحب اور یہی مولانا احمد صاحبؒ مسلسل مشوروں میں شریک رہے۔ صبح کو اِشراق کے بعد چائے سے فراغ پر یہ چاروں کتب خانے میں تشریف لے

جاتے اور اندر کی زنجیر لگالیتے، اور بارہ بجے کے قریب جب حضرت سہارن پوری قدس سرہٗ کے کارکن حاجی مقبول احمد صاحب بار بار تقاضا کرتے کہ کھانا ٹھنڈا ہوگیا، تو دیر تک تو جواب ہی نہ ملتا، اور پھر بہت دیر کے بعد مولانا احمد صاحبؒ کہتے کہ آرہے ہیں، آرہے ہیں، اور ظہر کی اَذان کے قریب یہ حضرات اُترتے اور جلدی جلدی ٹھنڈا گرم کھانا نوش فرماتے اور پھر ظہر کی نماز کے بعد اُوپر تشریف لے جاتے اور عصر کی اَذان کے قریب اُترتے۔ جیسا کہ میں ''آپ بیتی''، نمبر ۴ کے صفحہ ۲۸ پر اس واقعے کو ذِکر کر چکا ہوں۔

مولانا حکیم احمد صاحبؒ ہمارے اکابر کے یہاں بڑے مدبر، ذِی رائے سمجھے جاتے تھے۔ اہم مشوروں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے دونوں مدرسوں کے ہمیشہ اہلِ شوریٰ میں داخل رہے۔ بڑے متقی تھے، اور میرے چوں کہ ننھیال کی طرف سے رشتے دار بھی تھے اس لیے مجھ پر شفقت بھی بہت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے میری ابتدائی مدرّسی کے زمانے میں فرمانے لگے کہ

> ''مولوی زکریا! تمہارے ان مدرسوں سے کچھ آتا جاتا ہو، اس کو تو تم جانو۔ ہم تو ایک بات جانیں کہ باپ داداؤں سے یہ سنتے آئے تھے کہ فلاں چیز نہیں کھانی، یہ نہیں کھانا، وہ نہیں کھانا۔ تمہارے مدرسوں میں پڑھ کر یہ چیز جاتی رہتی ہے، جو چاہے کھلادو، زکوٰۃ کا کھلادو، صدقے کا کھلادو، تیجے کا کھلادو۔''

مجھ پر بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے، مجھے اپنے رام پور کے مدرسے کے لیے حضرت قدس سرہٗ سے کئی بار مانگا، مگر حضرتؒ نے ہر مرتبہ یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ یہ تو مظاہر میں رہے گا۔

عزیز عامر نے لکھا ہے کہ دادا صاحب کی پیدایش ۲۰/ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ

(۶/اپریل ۱۸۶۶ء) قبیل صبحِ صادق ہوئی، محمد ظریف تاریخی نام ہے، اور یہی بندے کی تاریخ کبیر میں بھی ہے، اس میں سن وفات اوائل ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) تحریر ہے۔ رام پور کے اپنے جدی قبرستان میں جناب الحاج حافظ محمد یوسف صاحب ابن جناب حضرت الحاج حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے برابر میں دفن ہوئے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ واعلی اللہ مراتبہ!

ض ۱۳، مولانا سر رحیم بخشؒ:

بھاول پور کے سفر کے متعلق ایک واقعہ اس ناکارہ کے بھی علم میں ہے، اور اس جام کو پڑھ کر بندے کے ذہن میں آیا کہ غالباً وہ واقعہ بھی اسی سفر کا ہے جس کو میں لکھوا رہا ہوں، اور یاد پڑتا ہے کہ ''آپ بیتی'' میں اس واقعے کو کہیں لکھوا بھی چکا ہوں کہ حضرت مولانا الحاج سر رحیم بخش صاحبؒ سر پرست مدرسۂ مظاہر علوم متوطن ٹھسکہ میرانجی ریاست بھاول پور کے وزیر تھے، اور نواب صاحب بھاول پور کے انتقال کے بعد چوں کہ نواب زادہ ولی عہد کم سن تھے، اس لیے یہ ان کے اتالیق کے طور پر ان کے بلوغ تک نواب صاحب کے قایم مقام رہے، اور سارے اِختیارات ریاست کے ان ہی کے قبضے میں تھے، اور چوں کہ حضرت قطبِ عالم گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت تھے اس لیے حضرت کے اجل خلفائے اَربعہ اور حضرت حکیم الامتؒ سے بہت خصوصی تعلق تھا، اور ان کے اس خصوصی تعلق کی بنا پر ان حضراتِ اکابر کا ان کی درخواست پر بھاول پور کثرت سے تشریف لے جانا ہوا کرتا تھا۔ بہت ہی خوبیوں کے آدمی تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق علی میاں نے عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح کے بابِ اوّل، صفحہ ۹۲ میں اس سیہ کار کا ذِکر کرتے ہوئے اس ناکارہ کے متعلق دو اِبتلا لکھے، جس میں سے دُوسرا کرنال میں مدرّسی کے لیے اس ناکارہ پر وہاں

کی مدرّسی کے لیے زور دیا۔ مرحوم کی کوئی سوانح بھی ان کے انتقال کے بعد لکھی گئی تھی جو اس وقت یاد نہیں۔ باوجود نواب صاحب کی قایم مقامی کے ایسی سادہ زندگی گزارتے تھے کہ جب انگریزی درباروں میں وایسرائے وغیرہ یا وزیرِ ہند کی آمد پر کوئی دربار ہوتا تو وہ اس میں ضرور مدعو ہوا کرتے تھے، اور ان کی کرسی نوابوں کی کرسی کے پاس ہی ہوتی تھی۔ چوں کہ سادہ لباس ہوا کرتا تھا اور بہت ہی سادہ، اور ان کا ملازم نہایت ہی خوش پوشاک، کوٹ بھی زرّیں قیمتی، جس پر سنہرے بٹن بھی کثرت سے لگے ہوئے ہوتے تھے، پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ سارے درباری یہ سمجھتے کہ یہ ملازم تو وزیر صاحب ہیں اور ان کا چوب دار آگے آگے جا رہا ہے، لیکن جب دربار میں پہنچنے کے بعد یہ اپنی کرسی پر بیٹھے اور ملازم چونری لے کر کسی کے پیچھے کھڑا ہوتا جب لوگوں کو معلوم ہوتا کہ یہ وزیر صاحب ہیں اور یہ ان کے چوب دار۔ بڑی خوبیاں تھیں۔ اپنی اس نوابی کے زمانے میں ریاست کے سارے کاروبار نمٹنے کے بعد اپنے والد کے، جو ایک کسان تھے اور سارا لباس ان کا گوجروں جیسا ہوتا تھا، ان کے پاؤں سارے عملے اور سارے خدام کے سامنے دبایا کرتے تھے، اور جب ان اطراف میں آتے تو ان اکابر کے سامنے ایسا دوزانو بیٹھتے جیسا کوئی بہت ادنا خادم ہو۔ ان کے محاسن کے واسطے تو بڑا دفتر چاہیے۔

ایک مرتبہ ان کی طلب پر حضرت اقدس سہارن پوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت حکیم الامتؒ تینوں ساتھ ہی بھاول پور تشریف لے گئے اور ساتھ ہی واپس تشریف لائے۔ واپسی پر انھوں نے ہر سہ حضرات کی خدمت میں علی التساوی ایک گراں قدر ہدیہ پیش کیا، شیخین نے تو قبول کرلیا اور حضرت حکیم الامت نوّر اللہ مرقدہٗ نے یہ کہہ کر اِنکار کردیا کہ مجھے چوں کہ اِشرافِ نفس ہوگیا

تھا، اس لیے قبول سے معذوری ہے، اور ان دونوں حضرات کو نہیں ہوا ہوگا۔ مولانا رحیم بخش صاحبؒ نے وہ رقم فوراً لے کر اپنی جیب میں رکھ لی اور اِشارتاً بھی کوئی لفظ اس کے قبول کرنے کے متعلق نہیں کہا۔ یہ سب حضرات ان سے رُخصت ہوکر ریل میں سوار ہوگئے، مولانا رحیم بخش صاحبؒ نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے حضرت حکیم الامتؒ کی رقم ایک لفافے میں بند کر کے بھیجی اور اس میں ایک پرچہ لکھا کہ

> ''حضرتِ والا نے اَشرافِ نفس کے اِحتمال سے یہ ناچیز ہدیہ واپس فرمادیا تھا، اور اس خاک سار کو حضرتِ اقدس کی منشا کے خلاف مکرّر درخواست کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن اب تو حضرت واپس جاچکے اور اِشراف کا کوئی اِحتمال بھی نہیں رہا، اس لیے اُمید ہے کہ اس ناچیز ہدیے کو قبول فرمالیں گے، اور اگر اَب بھی کوئی گرانی ہو تو حضرت کی طبعِ مبارک کے خلاف ذرا اِصرار نہیں۔''

اس مضمون کا پرچہ لفافے میں بند کر کے اس نوکر سے کہا کہ جب ۷، ۸ اسٹیشن گزر جائیں تو فلاں جنکشن پر یہ بند لفافہ حضرت کی خدمت میں پیش کر دینا اور پوچھ لینا۔ حضرت اگر کچھ جواب دیں تو لیتے آنا ورنہ چلے آنا۔ چناں چہ حسبِ ہدایت ملازم نے چند اسٹیشن جا کر وہ لفافہ پیش کیا اور حضرتؒ نے پڑھا اور بہت ہی اِظہارِ مسرّت کیا اور فرمایا کہ ''محبت خود طریقے سکھلا دیتی ہے!''

مجھے تو اس قصے پر ہمیشہ ایک مصرع یاد آتا ہے کہ ع

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

بہرحال! حضرتؒ نے قبول فرما کر تحریر فرمایا کہ

> ''خدا تعالیٰ آپ کے فہم وذکا میں ترقی عطا فرمائے، واقعی اب مجھے کوئی عذر نہیں۔''

مولانا سر رحیم بخش صاحبؒ کا اصل وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع کرنال تھا۔ نواب صاحب کے بلوغ پر جب وہ خود بااِختیار ہوگئے تو یہ بھاول پور سے پنشنر ہوکر اپنے وطن ٹھسکہ تشریف لے آئے تھے، اور صرف انیس گھنٹے بیمار رہ کر بہ وقت چار بجے صبح شنبہ ۳۰ر محرم ۱۳۵۴ھ مطابق ۴ر مئی ۱۹۳۵ء بہ عمر چھہتر سال عیسوی رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ!

۱۳۰۴ھ (۱۸۸۷ء) میں ذِی الحجہ کے پورے مہینے گنگوہ قطبِ عالم کی خدمت میں رہے اور بیعت سے مشرف ہوئے، اور واپسی پر حافظ علیم الدین گنگوہی کو، جو اس وقت بچے تھے، اپنے ساتھ ملازم بنا کر لے گئے۔ حافظ صاحب مرحوم بھی مولانا کے نہایت ہی وفادار خادم حضر وسفر کے حاضر باش، نہایت سادہ مزاج، مولانا مرحوم کے انتقال کے کئی سال بعد تک ٹھسکہ ہی میں رہے، اور گھر کا سارا مہمانوں وغیرہ کا انتظام حافظ صاحب مرحوم ہی کے ذمے تھا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے چند سال پہلے انہوں نے اپنے ضعف کی وجہ سے اپنے بھتیجے کو بھی ملازم کر دیا تھا، جو نہایت جوان فوجی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُوپر جس خوش پوشاک ملازم کا ذِکر کیا گیا، وہ یہی دُوسرے ملازم تھے۔ (تاریخ کبیر)

ض ۱۴، علما کا اختلاف مذموم نہیں:

اس نوع کا ایک ارشاد حضرت حکیم الامتؒ کا حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کے متعلق بھی ہے، جس کی تفصیل ''آپ بیتی'' نمبر ۴ میں حضرت حکیم الامتؒ کے احوال میں گزر چکی ہے، جو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کی گرفتاری محرم ۱۳۵۱ھ (مئی ۱۹۳۲ء) کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

> ''علمائے حقہ میں رائے کا اِختلاف مذموم چیز نہیں بلکہ محمود ہے، بڑی رحمت ہے، بہ شرطے کہ خلاف نزاع مجادلہ کا ذریعہ نہ بنے۔''

اس ناکارہ نے تو جب سے مشکوٰۃ شریف شروع کی تھی اسی وقت سے علما کے اِختلاف کو بالخصوص صحابۂ کرامؓ، اَئمۂ مجتہدینؒ کے اِختلاف کو بڑی رحمت سمجھتا رہا ہے۔ یہ میرا طبعی ذوق ہے، لیکن جب کتبِ حدیث میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز عمر ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ مقولہ نظر سے گزرا کہ

"مجھے اس بات سے مسرّت نہ ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں اِختلاف نہ ہوتا، اس لیے کہ ان میں اگر اِختلاف نہ ہوتا تو گنجائش نہ رہتی۔"

حدیثِ پاک کے پڑھانے کے درمیان میں ہمیشہ میں نے اس پر زور دِیا کہ اہلِ حق کا اِختلاف مبارک ہے، مذموم نہیں۔ اب سے چونتیس سال پہلے جب کہ حضرت حکیم الامت اور حضرت شیخ الاسلام مدنی نوّر اللہ مرقدہما کے درمیان میں لیگ- کانگریس کا اِختلاف تھا۔ اس وقت شعبان ۱۳۵۷ھ (اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں اس ناکارہ کا ایک رسالہ "الاعتدال فی مراتب الرجال" شایع ہوا تھا، جس کو میرے دونوں اکابر اور ان کے مخصوص خدام نے بہت ہی پسند کیا تھا۔ بالخصوص حضرت اقدس مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ اور میرے چچا جان حضرت مولانا محمد اِلیاس صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کے شدید اِصرار پر وہ رسالہ نہایت عجلت میں طبع کرایا گیا تھا، اور اس کے بعد سے ہندو پاک میں کئی مرتبہ طبع ہو کر فروخت اور تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کے سوال نمبر ۷ کے جواب میں یہی مضمون بہت تفصیل سے لکھا گیا تھا، اور میرے حضرت شیخ الاسلام مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کے سفری بیگ میں تو یہ رسالہ مستقل رہتا تھا اور اَسفار میں کبھی کبھی ملاحظہ بھی فرماتے رہتے تھے۔

طبایع میں اختلاف:

میرے اکابر میں مسائل میں نہیں بلکہ طبائع میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا، اور اس اِختلاف پر ثمرات بھی بہت مختلف مرتب ہوتے رہے۔ حضرت اقدس شیخ المشایخ حاجی اِمدادُ اللہ قدس سرہٗ کے یہاں رحم دلی، دِل داری کا بہت غلبہ تھا، حضرت تھانویؒ نے ایک ملفوظ میں تحریر فرمایا ہے کہ

''حضرت حاجی صاحبؒ تھانہ بھون میں اپنے مشاغل سے فارغ ہوکر دوپہر کے وقت قیلولے کے لیے ایک مرتبہ لیٹے تو ایک صاحب تخلیہ کا وقت دیکھ کر آبیٹھے، اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اور حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ پر نیند کا غلبہ، آنکھیں بند ہوتی تھیں، لیکن ان کی دِل داری میں کچھ نہ فرمایا۔ دُوسرے دِن پھر ایسا ہی ہوا کہ حضرتؒ بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ یہ صاحب یہ سمجھ کر آئے تھے کہ تخلیہ کا وقت ہے، تنہائی میں خوب توجہ ہوگی، تو حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے اپنی جگہ سے للکار کر ان صاحب سے کہا کہ 'خود تو رات بھر بیوی کو بغل میں لیے پڑے سوتے رہتے ہو اور یہ بے چارے رات بھر اللہ کے ذِکر میں مشغول رہتے ہیں، دوپہر کو تھوڑا سا وقت لیٹنے کو ملتا ہے تو تم لغویات میں وقت ضایع کردیتے ہو۔ اگر اَب سے اس وقت آئے تو ٹانگیں توڑ دُوں گا۔''

حافظ صاحبؒ بہت تیز مزاج تھے، کبھی حضرت حاجی صاحبؒ کو بھی اور کبھی مولانا شیخ محمد صاحبؒ کو بھی سنا دیتے تھے: ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!

اسی طرح حضرتِ اقدس گنگوہی قدس سرہٗ اور حضرتِ اقدس نانوتوی قدس سرہٗ کے مزاج میں بھی طبعی اِختلاف تھا کہ حضرت نانوتویؒ کے یہاں دِل داری کا

مضمون بہت بڑھا ہوا تھا۔ حضرت تھانویؒ اپنے ایک ملفوظ ''حسن العزیز'' جلد اوّل، صفحہ ۴۹۵ میں یہ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہوتا تو اِشراق اور چاشت بھی قضا کر دیتے تھے۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ کی اور شان تھی، کوئی بیٹھا ہو، جب وقت اِشراق یا چاشت کا آیا وضو کر کے وہیں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اُٹھیں کہ میں نماز پڑھ لوں یا اُٹھنے کی اجازت لیں۔ جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیے، چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو۔ وہاں یہ شان تھی جیسے بادشاہوں کی شان۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ جب حج کو چلے تو بمبئی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ تو لوگوں سے ملتے پھرتے اور مولانا گنگوہیؒ انتظام میں مشغول رہتے، جب مولانا محمد قاسم صاحبؒ واپس آتے تو مولانا گنگوہیؒ فرماتے کہ 'کچھ فکر بھی ہے کہ کیا انتظام کرنا ہے؟ آپ ملتے جلتے ہی پھرتے ہیں!' مولانا فرماتے کہ 'مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے، جب آپ بڑے سر پر موجود ہیں!'

پھر فرمایا کہ: ایک بار مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا گنگوہیؒ سے فرمانے لگے کہ 'ایک بات پر بڑا رشک آتا ہے، آپ کی نظر فقہ پر بہت اچھی ہے، ہماری ایسی نظر نہیں!' بولے کہ 'جی ہاں! ہمیں کچھ جزئیات یاد ہو گئیں تو آپ کو رَشک ہونے لگا، آپ مجتہد بنے بیٹھے ہیں، ہم نے کبھی آپ پر رَشک نہیں کیا۔' ایسی ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ انہیں اپنے سے بڑا سمجھتے تھے اور وہ انہیں''۔

مسئلہ بتادو، دلائل نہیں سنوں گا:

اس ملفوظ میں حضرت تھانویؒ نے حضرت گنگوہیؒ کے اور بھی کئی واقعات

بیان فرمائے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا (ص ۱۴۵) کہ

''ایک مرتبہ نانوتہ میں مولانا مظفرحسین صاحبؒ تشریف لائے، وہاں حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ ومولانا محمد یعقوب صاحبؒ ومولانا محمد قاسم صاحبؒ موجود تھے، فرمایا: 'بھائی! ایک مسئلے میں تردّد ہے، میں نے سنا تھا کہ سب صاحب زادے جمع ہیں، اس لیے مسئلہ پوچھنے آیا ہوں، وہ مسئلہ یہ کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں علما اِختلاف کرتے ہیں کہ جائز ہے یا نہیں؟ بس تم لوگ آپس میں گفتگو کر کے ایک منقح بات بتلادو کہ جائز ہے یا نہیں؟ میں دلائل نہیں سنوں گا!' چناں چہ سب حضرات نے آپس میں گفتگو کی، مولانا نے ادھر اِلتفات بھی نہیں فرمایا۔ گفتگو کر کے ان حضرات نے عرض کیا کہ 'حضرت! طے ہوگیا، جائز ہے!' فرمایا کہ: 'اچھا! تو پھر میں جاتا ہوں۔' عجیب شان کے لوگ تھے''۔

کوئی لگی لپٹی نہیں:

ملفوظ صفحہ ۲۸۱، حسن العزیز، جلد اوّل میں لکھتے ہیں کہ

''حضرت مولانا نانوتوی نوّر اللہ مرقدہٗ کھلم کھلا کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے، اور حضرت گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ صاف صاف کہتے تھے، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، چاہے کوئی رہے چاہے کوئی جائے۔ پہلے میں بھی نرم جواب کو پسند کرتا تھا، لیکن اب تجربے کے بعد مولانا گنگوہیؒ کا طرز نافع ثابت ہوا۔''

ہر ایک کو بستر کہاں سے دو گے؟

اور دُوسرے ملفوظ میں تحریر فرماتے ہیں (نمبر ۴۰۲) کہ

''حضرت گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ کا اِرشاد ہے کہ تحمل سے زیادہ کبھی

اپنے ذمے کام نہ لے!' چناں چہ ایک صاحب نے مولانا کے کسی مہمان سے بسترے کو پوچھ لیا، تو معلوم ہونے کے بعد فرمایا کہ 'اگر اس کے پاس نہ ہوتا تو تم کہاں سے دیتے؟ اور اگر ایک دو بستر کہیں سے لاکر دے بھی دیتے تو اگر بہت سے مہمان آتے اور کسی کے پاس بھی بسترہ نہ ہو تو سب کے لیے کہاں سے لاؤ گے؟ خبردار! جو کسی سے بسترے کے لیے پوچھا، جو آئے اپنے ساتھ بستر لے کر آئے۔''

اپنی رضائی کیوں دوں؟

اسی طرح سنا گیا کہ ایک مرتبہ جاڑے کے زمانے میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی رضائی تو کسی مہمان کو دے دی، پھر مولانا گنگوہیؒ سے ان کی اپنے لیے رضائی مانگی تو فرمایا کہ ''اپنی رضائی کیوں دُوسرے کو دے دی؟ میں تو اپنی رضائی نہیں دیتا!'' جب انہوں نے کہا کہ ''حضرت! میں رات بھر جاڑے میں مروں گا!'' تب دو شرطوں سے دی: ایک یہ کہ تہجد کے وقت مجھے واپس کر دینا، کیوں کہ لحاف اوڑھ کر مجھ سے نہ اُٹھا جائے گا، اور دُوسرے کسی اور شخص کو مت دینا تا کہ کسی کی جوں نہ چڑھ جائے۔ فقط!

خدام میں اکابر کے طبائع کا اثر:

اس اِختلافِ طبائع کا اثر ان حضرات کے خدام میں بھی نمایاں تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شیخ الاسلامؒ میں قاسمی رنگ کا غلبہ تھا، اور حضرت سہارن پوریؒ اور حضرت تھانویؒ میں حضرت گنگوہیؒ کے رنگ کا غلبہ تھا، اور حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ کا تو عجیب معاملہ تھا کہ رنگِ طبیعت تو قاسمی رنگ کا تھا، لیکن ہیبت کا اثر خدام پر اتنا ہوتا تھا کہ عملاً گنگوہی طرز کا ظہور رہتا تھا، اور یہ اِختلافِ طبائع حادث نہیں، بلکہ قدیم ہے۔ میں نے اپنے رسالے ''اعتدال'' میں ایک

حدیث نقل کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک اِرشاد ہے:

''آسمان میں دو فرشتے ہیں: ایک سختی کا حکم کرتے ہیں، دُوسرے نرمی کا، اور دونوں صواب پر ہیں۔ ایک جبریل علیہ السلام، دُوسرے میکائیل علیہ السلام، اور دو نبی ہیں: ایک نرمی کا حکم کرتے ہیں، دُوسرے سختی کا، اور دونوں صواب پر ہیں۔ ایک ابراہیم علیہ السلام، دُوسرے نوح علیہ السلام، اور میرے دو ساتھی ہیں: ایک نرمی کا حکم کرتے اور دُوسرے سختی کا۔ ایک ابوبکر، دُوسرے عمر۔''

یہ مضمون ''اعتدال'' میں بہت تفصیل سے آچکا ہے، اس لیے اکابر کے اِختلافِ رائے اور اِختلافِ طبائع کو ہم جیسوں کے آپس کے اِختلاف پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اِرشاد کہ

''باوجود اِختلاف کے اِنجذاب ہوتا تھا''

کوئی نئی چیز نہیں۔ حضراتِ شیخین کی آپس کی محبت کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

میرے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ اس سیہ کار سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ

''میرا تمہارا ہر چیز میں تو اِختلاف، مجھے میٹھے کا شوق، تمہیں نفرت۔ میں مرچ کے پاس نہیں جاتا، تم سے بغیر مرچ کھایا نہیں جاتا۔ تم گوشت بغیر نہیں کھاسکتے اور میں گھاس کھانے والا!''

وغیرہ وغیرہ، کے بعد فرمایا کرتے تھے:

''پھر معلوم نہیں تمہاری طرف اتنی کشش کیوں ہے؟''

پھر بعض دفعہ فرمادیا کرتے کہ

''اس اِختلافِ طبائع کے باوجود معلوم نہیں تم سے عشق کیوں ہوگیا؟''

بہر حال علما اور اکابر کا اِختلافِ رائے اور اِختلافِ مسائل بہت ہی مبارک ہے، مگر ہم جیسے نا اہل، نالایق اس کو ایک فتنہ بنا دیتے ہیں۔

ض ۱۵:

''اصلاح انقلاب'' جلد دوم میں مستقل رسالہ ''الخطوب المنيبة للقلوب المنيبة'' میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ وہاں حضرت کے نام کو ایک بزرگ صاحبِ اِرشاد و تلقین کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔

گنجِ بے رنج

پہلی حاضری:

مجھ کو دو مرتبہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یقین کے ساتھ تو ماہ وسنہ یاد نہیں ہیں، لیکن گمانِ غالب سے کہتا ہوں کہ اوّل مرتبہ جب حاضر ہوا ہوں تو ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) تھا اور مہینہ بھی غالباً ربیع الثانی (فروری) یا جمادی الاولیٰ (مارچ) تھا۔ کیوں کہ مجھے اتنا یاد ہے کہ یہ حاضری تعلق ملازمت کان پور کے کچھ بعد تھی، اور تعلق کان پور کا زمانہ آخر صفر تھا جو قرب میلاد کا زمانہ تھا، اور اکثر لوگ میلاد کے مسئلے مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ نیا نیا مدرّس ہو کر کان پور گیا تھا۔ بعض وجوہ سے دو مہینے کے بعد ملازمت چھوڑ دی اور تھانہ بھون واپسی کا ارادہ کیا، گو بعد کو مدرسۂ جامع العلوم کی بنیاد پڑ گئی اور مجھے رُکنا پڑا۔ اسی زمانے میں جب کہ کان پور کو چھوڑنے کا قصد کر لیا تھا، یہ خیال ہوا کہ حضرت مولاناؒ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرتا جاؤں، کیوں کہ معلوم نہیں پھر اس طرف آنے کا کبھی اتفاق ہو یا نہ ہو؟

چناں چہ ایک طالب علم مہدی حسن تھے جو قرآن شریف پڑھا کرتے تھے، ان کو ہم راہ لے کر مرادآباد کے قصد سے روانہ ہوا، اناؤ تک ریل سے مسافت طے کی، باقی راستہ ٹٹو (خچر) سے قطع کیا۔ راستہ کچھ اچھا نہ تھا، ایسا ہی تھا، کوئی

باقاعدہ سڑک نہ تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ ہم دونوں راستے سے واقف نہ تھے۔ نہ کوئی پتا نشان، نہ کسی سے پوچھا تھا، یوں ہی چل کھڑے ہوئے تھے، اور ٹٹو والا افیونی تھا، وہ پینک میں کہیں پیچھے رہ گیا، ہم اکیلے چلے جارہے تھے، لیکن ہم دونوں راستے سے ناواقف تھے، ناواقفی کی وجہ سے کئی جگہ راستہ بھولے۔ جب کوئی گاؤں نظر آتا اس میں جاکر راستہ پوچھتے پھر آگے چلتے۔ غرض کئی جگہ شبہ ہوا، اس شبہے اور دھوکے ہی میں دن ختم ہوگیا، لیکن برابر چلتے ہی چلے گئے، کیوں کہ شوقِ زیارت شدّت کا تھا۔

بہت تیزی سے ایک ساتھ تین سوال:

خدا خدا کر کے پہنچے، عشا کی نماز ہوچکی تھی، مولانا مسجد سے حجرے میں تشریف لے جاچکے تھے، خادم کے ذریعے اطلاع کرائی گئی، حضرتؒ نے بلالیا اور میں نے رفیق کو اسباب کے پاس چھوڑا اور خود اسی خادم کے ہم راہ حاضر ہوگیا۔ اتنا یاد ہے کہ وہاں ایک جانب تخت بچھا ہوا تھا، جس کے پاس ایک بوریا بھی بچھا ہوا تھا، اور حضرت مولاناؒ ایک دُوسری جانب چارپائی پر تشریف فرما تھے، میں سامنے جاکر کھڑا ہوگیا اور سلام عرض کیا۔ جواب دینے کے بعد اپنے مخصوص لہجے میں بہت تیزی سے ایک ساتھ تین سوال کیے:

کون ہو؟

کہاں سے آئے ہو؟

کیوں آئے ہو؟

حضرتؒ کی گفتگو کا انداز:

حضرت مولاناؒ کا لہجہ طبعی طور پر سادہ تھا، مزاج میں سادگی بہت تھی، عرفی

تکلف کے پابند نہ تھے، صاف طبیعت تھے، گفتگو میں لہجہ ذرا تیز ہوتا تھا۔ خصوص اُس کے ساتھ جو معتقد ہوکر جائے، جیسے میں گیا تھا، اور وہاں تو اکثر لوگ معتقدانہ ہی حاضر ہوتے تھے۔ ایسا لہجہ تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص دیکھے تو یہ گمان کرے کہ مولانا غصہ فرمارہے ہیں۔ حال آں کہ یہ بات نہ تھی۔ جس کو دو چار بار حاضری کا اتفاق ہوجاتا تھا وہ تو اچھی طرح سمجھ لیتا تھا کہ حضرتؒ کا لہجہ ہی ایسا ہے۔ لطف وعنایت کی گفتگو میں بھی اکثر لہجے کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

غرض مولانا نے تیز لہجے میں یہ تین سوال ایک ساتھ کیے:

کون ہو؟

کہاں سے آئے ہو؟

کیوں آئے ہو؟

ارے یہ کوئی زیارت کا وقت ہے؟

میں نے بھی ادب کے ساتھ ان تینوں سوالوں کے جواب میں عرض کیا کہ میں ایک طالب علم ہوں، کانپور سے آیا ہوں، زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر اور تیز ہوئے اور فرمایا:

> ''بڑے آئے زیارت والے! ارے یہ کوئی وقت زیارت کا ہے؟ ایسے وقت کسی کی زیارت کو آیا کرتے ہیں؟ آدمی کو چاہیے کہ ذرا سویرے آئے، دُوسرا کچھ روٹی وغیرہ کا انتظام تو کرسکے۔ اب بتلاؤ! تمہارے لیے کھانا کہاں سے لاؤں؟ تمھیں خدا کا خوف نہ آیا، تم کو زمین نہ نگل گئی۔''

عقیدت کا خلاصہ:

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے جو اپنے دِل کو دیکھا تو مطلق کسی قسم

کی کوئی شکایت یا رنج نہ پایا، بلکہ اس سے زیادہ بھی کہہ لیتے تب بھی ذرا نا گوار نہ ہوتا۔ کیوں کہ خاص عقیدت کے ساتھ حاضر ہوا تھا، اور عقیدت کا خاصہ یہی ہے، گو میرے پاس عذر تھا، لیکن میں نے اس وقت کچھ عرض کرنا خلافِ ادب سمجھا۔ یہ ایک تنبیہ تھی، سو میں کیا اس کا جواب دیتا؟ چپ کھڑا تھا۔

تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟

تھوڑی دیر بعد فرمایا:

''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

میں نے عرض کیا: جی ہاں! ہیں۔ فرمایا:

''اچھا! جاؤ اور بازار سے کچھ لے کر کھالو اور صبح چلے جاؤ۔''

میں نے عرض کیا: بہت اچھا۔ اس ارشاد کے بعد خادم سے کہا:

''انہیں لے جا کر فلاں مکان میں ٹھہرادو''۔

اجی یہاں آجاؤ:

چناں چہ ہم لوگ ساتھ ہولیے اور اُس نے لے جا کر ایک جگہ دِکھادی۔ ایسا خیال ہے کہ وہ ایک عام جگہ تھی، محفوظ جگہ نہ تھی، سہ دری سی تھی، خیر مع ٹٹو اور رفیق کے وہاں چلا گیا اور سامان اُتارنے لگا، یہی ارادہ تھا کہ بازار سے لے کر کچھ کھا پی لیں گے اور حسب الحکم صبح کو رُخصت ہو جائیں گے۔

لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایک خادم آیا اور کہا کہ مولانا نے یاد فرمایا ہے۔ میں نے دِل میں کہا کہ کچھ اور یاد آیا ہوگا، لیکن میں نے دِل میں کہا کہ بھائی سننے کو تو ہم آئے ہی ہیں۔ میں ساتھ ہولیا اور جا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ فرمایا: ''بیٹھ جاؤ۔'' مگر لہجہ اب بھی ویسا ہی تھا، حال آں کہ اس وقت لطف اور شفقت موجود تھی، جیسا کہ بعد کے برتاؤ سے معلوم ہوگا۔ کچھ لہجہ ہی ایسا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ طبیعت میں

سادگی تھی، تصنّع اور تکلف نہ تھا۔ میں یہ ارشاد سن کر تخت کے پاس جو چٹائی بچھی ہوئی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ فرمایا:

''اجی یہاں آجاؤ، تخت پر بیٹھو۔''

حسبِ ارشاد اُٹھ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ پھر خادم سے فرمایا کہ

''ان کے لیے ہماری بیٹی کے یہاں سے کھانا لاؤ۔''

چناں چہ خادم اسی وقت جا کر کھانا لایا، ایک پیالے میں سالن تھا، غالباً ارہر کی دال تھی اور اسی پر روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جب خادم نے کھانا میرے سامنے لا کر رکھا تو مولانا نے دیکھ لیا۔ حال آں کہ چراغ کی روشنی بھی کم تھی اور میں بھی کسی قدر فاصلے پر تھا۔ نظر حضرتؒ کی اس عمر میں بہت اچھی تھی۔ کھانا دیکھ کر خادم سے فرمایا:

''بدتمیز! یوں کھانا لایا کرتے ہیں مہمان کے واسطے؟
ارے روٹی الگ طباق میں لاتا، سالن علاحدہ برتن میں لاتا۔ یہ کون سا طریقہ ہے کہ پیالے پر روٹیاں رکھ کر لے آیا؟''

خادم نے عرض کیا کہ میں نے طباق ڈھونڈا، ملا نہیں۔ فرمایا:

''جھوٹ بولتا ہے۔ ارے فلانے طاق میں رکھا نہیں ہے؟''

یہ غالباً کشف سے فرمایا۔ مولانا کو کشف بہت ہوتا تھا، خادم یہ سن کر دوڑا ہوا گیا اور طباق لے آیا، ورنہ سب روٹیاں ہاتھ میں لے کر کھانا پڑتیں۔

بہت بڑی تعریف:

جب میں نے کھانا شروع کیا تو فرمایا:

''کیا کھانا ہے؟''

میں نے عرض کیا: حضرت! ارہر کی دال ہے اور روٹی ہے۔ فرمایا:

''سبحان اللہ! یہ تو بڑی نعمت ہے۔تم تو لکھے پڑھے آدمی ہو،تم نے مولوی محمد یعقوبؒ سے پڑھا ہے''۔

مولانا کو کشف ہوا، پھر فرمایا:

''بہت اچھے آدمی تھے''۔

یہ گویا مولاناؒ نے بہت بڑی تعریف کی۔ کیوں کہ مولانا مبالغہ تعریف میں نہ کرتے تھے، اتنا فرمانا کہ''بہت اچھے آدمی تھے'' بہت بڑی تعریف ہے۔ اس سے حضرت مولاناؒ کا تعلق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بھی ثابت ہوگیا۔

تذکارِ صحابہؓ:

غرض فرمایا کہ

''تم تو لکھے پڑھے آدمی ہو،تم کو معلوم ہے کہ صحابہؓ کی کیا حالت تھی؟ ایک ایک چھوہارا کھا کر جہاد کرتے تھے اور دن دن بھر لڑتے تھے''۔

جب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ بڑھا تو جوش میں آکر کھڑے ہوگئے، عادت یہی تھی کہ بزرگانِ دِین کے تذکرے کے وقت جوش میں آجایا کرتے تھے۔غرض جوش میں کھڑے ہوگئے اور پاس آکر میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ لیا اور دیر تک حضراتِ صحابہؓ کا تذکرہ کرتے رہے۔ میں کھانا کھاتا رہا۔ ایسا خیال پڑتا ہے کہ ایک آدھ شعر بھی پڑھا۔

اجی تبرک وبرک چھوڑو:

پھر اس کے بعد فرمایا کہ''بیر کھاؤ گے؟''میں نے عرض کیا کہ حضرت کا تبرک ہے۔فرمایا:

''اجی تبرک وبرّک کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ بیر کھانے سے تمہارے پیٹ

میں درد تو نہیں ہو جاتا؟''

میں نے عرض کیا: حضرت! نہیں۔ پھر وہاں سے چلے اور ایک برتا ہوا بدھنا اُٹھا کر لے آئے، جس میں پیوندی بڑے بڑے بیر تھے، اور لا کر میرے سامنے اُلٹا کر دیا اور کہا: ''کھاؤ!''۔ پھر بہ طور مزاح کے فرمایا کہ

''کبھی دِل میں کہتے آپ ہی کھا لیے، مہمان کی بات بھی نہ پوچھی۔''

جب میں کھانے سے فارغ ہو گیا تو فرمایا:

''اچھا جاؤ! عشاء پڑھ کے سو رہنا، اب صبح کو ملاقات ہوگی۔''

پھر مولانا اس وقت تشریف لے گئے، خبر نہیں کہاں؟ حجرے میں یا مکان کے اندر؟ ہاں! حضرتؒ نے کان پور سے گنج مراد آباد تک قصر کے متعلق بھی کچھ سوال کیا تھا اور میں نے جواب بھی دیا تھا، اور اس پر حضرتؒ نے کچھ اصلاح بھی فرمائی تھی، لیکن تفصیل یاد نہیں۔ نہ سوال نہ جواب، نہ حضرتؒ کی اصلاح، کچھ یاد نہیں۔ پھر میں نے نماز پڑھی اور جائے قیام پر چلا گیا اور سو رہا۔

فجر کی نماز کی کیفیت:

صبح کی نماز مولانا کے پیچھے پڑھی۔ مولانا نے اسفار میں نماز پڑھی تھی اور خود اِمامت فرمائی۔ چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھیں۔ پھر ہم لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے، یہاں تک کہ آفتاب اچھا اُونچا ہو گیا۔ میرے سامنے مولانا نے نوافل نہیں پڑھے۔

شرم نہیں آتی پرائے ٹکڑوں پر پڑتے ہیں:

پھر اُٹھ کر ایک صاحب کی طرف متوجہ ہوئے جو سامنے کھڑے تھے، وضع سے کوئی رئیس معلوم ہوتے تھے، مگر ثقہ صورت، داڑھی بھی نیچی، چوغہ بھی اور پائینچے بھی ٹخنے سے اُوپر۔ سردیوں میں اکثر لباس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ رئیس

ہے یا معمولی حیثیت کا شخص۔ بہرحال مولانا نے ان کی جانب متوجہ ہوکر فرمایا: ’’تم کب جاؤ گے؟‘‘ انہوں نے کہا: جمعہ کی نماز پڑھ کر جاؤں گا۔ فرمایا: ’’یہاں جمعہ پڑھ کر کیا ہوگا؟‘‘ انہوں نے کہا: تو میں جمعہ اور کہاں پڑھوں گا؟ وہ بھی کوئی بے تکلف اور پُرانے آنے جانے والے معلوم ہوتے تھے۔ مولانا نے فرمایا:

’’ہمیں کیا خبر کہاں پڑھو گے؟ ہم کوئی ٹھیکے دار ہیں تمہارے جمعہ کے؟ لوگوں کو شرم نہیں آتی، منہ پر داڑھی لگاکر پرائے ٹکڑوں پر پڑتے ہیں‘‘۔

وہ بھی بہت ہی بے تکلف تھے، انہوں نے کہا: میں تو نہیں جاتا۔ یہ سن کر حضرت ان کا شانہ پکڑے ہوئے اور زور لگائے ہوئے لے چلے اور فرمایا: ’’نکلو یہاں سے(۱)۔‘‘

وظیفہ تعلیم فرمایا:

غرض وہ شخص تو چلے گئے، خبر نہیں قصبے سے بھی چلے گئے یا نہیں؟ میں نے دِل میں کہا کہ اب شاید میرا نمبر ہو، چناں چہ میں نے عرض کیا کہ ’’حضرت! میں جاتا ہوں۔‘‘ فرمایا: ’’بہت اچھا۔‘‘ میں چلا تو مولانا بھی ساتھ ساتھ چلے۔ میں سمجھا اِتفاقاً اپنی کسی ضرورت سے اسی جانب تشریف لے جارہے ہیں۔ یہ گمان نہ تھا نہ اپنے کو اہل سمجھتا تھا کہ مشایعت کے لیے ساتھ ہیں، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہی غرض تھی، کیوں کہ راستے میں مہمانوں کے ٹھہرنے کا جو مکان آتا حضرتؒ دریافت فرماتے کہ ’’کیا یہاں ٹھہرے ہو؟‘‘ حتیٰ کہ وہ سہ دری آگئی جس میں

(۱) اس مقام پر پہنچ کر حضرت حکیم الامت مدظلہ العالی نے فرمایا کہ ’’مجھے تو حضرتؒ کی ساری باتیں اچھی معلوم ہوتی تھیں، ممکن ہے کوئی معاند یا بدفہم اس قسم کے واقعات سے حضرت مولانا کے اخلاق پر شبہ کرے، ہمیں تو بزرگوں کی ساری ہی باتیں محبوب معلوم ہوتی ہیں، جس کو ذوق نہ ہو وہ جو چاہے سمجھے۔

میرا قیام تھا، میں وہاں رُک گیا تو مولانا بھی وہاں ٹھہر گئے اور فرمایا: ''ٹٹو منگاؤ اور سامان لاؤ''۔ میں نے رُخصتی مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت! میرے لیے دُعا کیجیے۔ فرمایا: ''ہم نے تمہارے لیے دُعا کی ہے''۔ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھ کو کچھ پڑھنے کو بتلا دیجیے۔ فرمایا:

''قل ھواللہ شریف، اور سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ دو دو سو بار پڑھ لیا کرو''۔

اوروں سے بھی سنا کہ حضرت مولاناؒ طالبین کو اکثر یہی پڑھنے کو بتایا کرتے تھے، کیوں کہ حدیث شریف میں ان چیزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اس کے بعد میں مع اپنے رفیق کے وہاں سے چلا آیا۔ چوں کہ میں مسافر تھا، جمعہ میرے ذمے تھا ہی نہیں، اس لیے فوت کا افسوس بھی نہیں ہوا۔

وہاں سے آجانے کے بعد ہی مدرسۂ جامع العلوم کی بنیاد پڑ گئی اور مجھ کو کان پور میں بہ اصرار روک لیا گیا، ورنہ پہلے تو یہ خیال تھا کہ اب کان پور چھوڑ رہا ہوں، حضرتؒ سے مل آنا چاہیے، ممکن ہے پھر نہ حاضری ہو، غرض میرا کان پور میں قیام ہوگیا۔

دوسری حاضری:

پہلی مرتبہ کی زیارت کے تو یہ واقعات تھے، دوسری مرتبہ مہینہ رمضان کا تھا، اور سن تو تقریباً یاد نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ پہلے سفر سے چند سال کے بعد دوبارہ حاضر ہوا۔ اس درمیان میں مولاناؒ کبھی کبھی آنے والوں کے ذریعے سے سلام کہلا بھیجتے تھے۔ مولاناؒ تو ایسے آزاد تھے کہ کوئی چیز بھی یاد نہیں رہتی تھی، نہ معلوم یہ کیسے یاد رہ گیا؟

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ مولاناؒ کا مزاج تیز تو تھا ہی، انہوں نے حضرت

مولاناؒ سے میرا نام لے کر نہایت بدتمیزی سے کہا کہ "آپ سے تو اُس کے اخلاق اچھے ہیں"۔ غایت تواضع سے فرمایا: "ہاں بے شک اچھے اخلاق ہیں"۔

مجھے جو پسند تھا وہ ہدیہ دیا:

پھر دوبارہ کئی سال کے بعد پھر حاضر ہوا، اس بار چند ہم راہی بھی تھے، اور ہدیے کے طور پر میں کچھ پیڑے بھی لے گیا تھا۔ کان پور میں اس زمانے میں بہت اچھے پیڑے بنتے تھے، جنھیں بنگالی پیڑے کہتے تھے۔ سانچے میں بنتے تھے، بہت خوب صورت اور خوش بودار ہوتے تھے۔ مجھے بہت پسند تھے۔ حضرتؒ کی پسند کی تو خبر نہ تھی۔ میں نے سوچا کہ جو چیز خود مجھے پسند ہے اسی کو ترجیح دینا چاہیے، چناں چہ میں نے پیڑے ہی ہدیے کے واسطے لیے۔ نیز چوں کہ رمضان شریف کا زمانہ اور مدرسے کی تعطیل تھی، اس لیے حضرتؒ کی خدمت میں کچھ دن رہنے کی گنجایش تھی، اس خیال سے کہ شاید دو چار دِن رہنا ہو جائے، ایک بوتل شربتِ انار کی بھی اپنے اِفطار کے واسطے ہم راہ لے لی تھی، کیوں کہ گرمی کا زمانہ تھا۔

حاضری کے وقت دل کی کیفیت:

جب مرادآباد قریب رہ گیا تو مجھے خیال ہوا کہ ہم لوگوں کے اعمال اچھے نہیں، اکثر بزرگوں کو قلب کی تاریکی کا احساس ہو جاتا ہے، اس لیے شاید ڈانٹ ڈپٹ فرماتے ہوں، لہٰذا اپنے قلب کو پاک صاف کر کے حاضرِ خدمت ہونا چاہیے۔ چناں چہ وضو کیا، اِستغفار کی کثرت کی، ادب کے لحاظ سے سواری چھوڑ کر پاپیادہ چلے۔

جوان ہو، روزہ ہی مناسب تھا:

اس حالت سے چلے جا رہے تھے، دوپہر کا وقت تھا، ایک بوڑھے شخص رستے

میں ملے، معلوم ہوا زیارت کو جارہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اوّل وہ پیش ہوئے، مولاناؒ نے ان سے پوچھا کہ روزہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! روزہ ہے۔ اس پر بہت خفا ہوئے۔ فرمایا: ''کس نے کہا تھا کہ سفر میں روزہ رکھو؟'' ان بے چاروں کو حکم ہوا کہ ''بس ابھی چلے جاؤ۔'' ہمارا بھی روزہ تھا، ہم نے کہا: بھائی خدا خیر کرے! ہم سے بھی یہی سوال ہوگا۔ چناں چہ واقعی پیش ہوئے تو یہ سوال فرمایا کہ ''روزہ ہے؟'' ہم نے سچی بات عرض کردی کہ حضرت ہے''۔ مگر بجائے خفگی کے حضرتؒ نے فرمایا کہ ''اچھا کیا! جوان آدمی ہو، روزہ رکھنا ہی مناسب تھا۔''

یوں بہ ظاہر مولاناؒ ذرا مغلوب سے تھے، ورنہ بڑے عالم تھے، بڑے متقی تھے، حدودِ شرعیہ سے خوب واقف تھے اور پورے متبع سنت تھے۔ دیکھیے! چوں کہ وہ صاحب بوڑھے تھے، ان کو سفر میں روزے کا تحمل دُشوار تھا، ان پر خفگی کا اظہار فرمایا، اور ہم لوگوں کے روزے پر اِظہارِ مسرّت فرمایا، اور یہی محل ہے حدیث:

لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ

کا۔

ہدیے کی قبولیت:

غرض ہم بہت خوش ہوئے کہ چلو ایک خطرے سے تو نجات ملی۔

اس وقت مولاناؒ ایک چارپائی پر تشریف رکھتے تھے۔ یہ نہیں پتا کہ بیٹھے تھے یا لیٹے تھے، غالبًا لیٹے تھے، نیچے چٹائی بھی بچھی تھی، اس پر ہم لوگ بیٹھ گئے، مولاناؒ نے غالبًا پہچانا نہیں۔ ہم نے اپنے اپنے ہدایا پیش کیے، مولاناؒ کو تمبا کو سے اور صابن سے بہت رغبت تھی، حقہ نوش فرماتے تھے اور کپڑے گھر ہی میں دُھلواتے تھے۔ میرے ہم راہی تمبا کو اور صابن ہدیے میں لے گئے تھے، اور مجھے خبر ہی نہ

تھی کہ مولاناؒ کو ان چیزوں سے رغبت ہے، اوروں نے تو تمبا کو اور صابن پیش کیا اور میں جو ہدیہ لے گیا تھا وہ میں نے پیش کر دیا، یعنی پیڑے، اوروں کی چیزیں لیں لیکن کچھ فرمایا نہیں۔ میں نے جو پیڑے پیش کیے تو خوش ہو کر فرمایا کہ ''ہم تو اس کا شربت پیا کرتے ہیں''۔

اور خادم سے فرمایا کہ ''انہیں اُٹھا کر رکھو، ہم ان کا شربت پیا کریں گے''۔

میں خوش ہوا، کیوں کہ میرا خیال تھا کہ میرا ہدیہ کیا پسند آئے گا، اوروں کا ہدیہ پسند فرمائیں گے، کیوں کہ وہ لوگ حضرتؒ کی رغبت کی چیزیں لائے تھے، لیکن خلافِ توقع معاملہ برعکس ہوا، اوروں کو بھی تعجب ہوا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، پھر اَز خود فرمایا کہ ''کیا تمہارے پاس کوئی دوا بھی ہے؟''

میں نے عرض کیا کہ حضرت! دوا تو میرے ساتھ کوئی نہیں ہے (کیوں کہ میں شربت انار کو دوا کے طور پر نہیں لے گیا تھا)۔ اس پر ساتھیوں نے مجھ سے آہستہ سے کہا کہ شربت انار تو ہے؟ میں نے مکرر عرض کیا کہ حضرت! شربت انار البتہ ہے۔ فرمایا: ''وہ تو تم نے اِفطار کے لیے اپنے ساتھ لیا ہے''۔

میں نے کہا: لایا تو تھا اِفطار ہی کی نیت سے، مگر اب جی چاہتا ہے کہ حضرت قبول فرمالیں۔ فرمایا: ''بہت اچھا''۔ چناں چہ میں نے پیش کیا اور حضرتؒ نے وہ بھی قبول فرمالیا۔

سجدہ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے اللہ نے پیار کرلیا:

ہدیوں سے فارغ ہونے کے بعد مختلف باتیں فرماتے رہے۔ بعض بعض یاد بھی ہیں، مثلاً: فرمایا کہ

''کہنے کی بات تو نہیں ہے، لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب میں سجدہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے پیار کرلیا۔''

نماز کا مزہ ہی الگ ہے:

دُوسری بات یہ فرمائی کہ

''بھائی! جنت کا مزہ برحق، حوضِ کوثر کا مزہ برحق، مگر نماز میں جو مزہ ہے کسی چیز میں نہیں''۔

بس اللہ قبر میں نماز کی اجازت دیدیں:

ایک یہ فرمایا کہ

''بھائی! ہم تو قبر میں بس نماز پڑھا کریں گے، دُعا ہے کہ ہمیں اللہ میاں قبر میں یہ اجازت دے دیں کہ بس نماز پڑھے جاؤ۔''

جب ہم جنت میں جائیں گے:

چوتھی بات میں کچھ شک ہے، اسی جلسے میں فرمایا یا بعد کے کسی جلسے میں، بلکہ اس میں بھی شک ہے کہ بلا واسطہ سنا، یا بہ واسطہ، بہر حال اگر بہ واسطہ بھی سنا ہوگا تو کسی ثقہ راوی ہی سے سنا ہوگا، کیوں کہ اس کی صحت کا مجھے اتنا وثوق ہے کہ بلا واسطہ سننے کا احتمال ہے۔ بہر حال چوتھی بات یہ فرمائی کہ

''جب ہم جنت میں جائیں گے''

اور یہ ایسے طور پر فرمایا جیسے یقین ہو کہ جنت میں ضرور جائیں گے، (حق تعالیٰ سے ایسی قوی اُمید تھی کہ کچھ شک ہی نہ تھا)

''اور حوریں آئیں گی تو ہم ان سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ بی! اگر قرآن سنانا ہو تو سناؤ، ورنہ جاؤ اپنا راستہ لو''۔

اس قسم کی شان مولاناؒ کی تھی۔

اتنے میں ایک شخص اندر چلا آیا، اس کو بہت ڈانٹا کہ بڑے بدتمیز ہو، منہ اُٹھائے چلے آرہے ہو، یہ نہیں دیکھتے ہو کہ موقع ہے یا نہیں؟ یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی

خاص بات کر رہا ہے۔ گویا مولاناؒ نے اپنے نزدیک ہم لوگوں کو خلوَت کا وقت دیا تھا۔ اپنے اسرار ظاہر کرنے کے لیے خلوَت پسند فرمائی۔

جب یہ باتیں ہو چکیں تو اِرشاد ہوا کہ ''مسجد میں بھی جگہ ٹھہرنے کی ہے اور مکان بھی موجود ہے، کہاں ٹھہرو گے؟''

میں نے عرض کیا کہ حضرت! جہاں آپ کا قرب ہو۔ فرمایا: ''تو مسجد میں ٹھہر جاؤ''۔

ہم لوگ مسجد میں ٹھہر گئے۔ دوپہر کا وقت تھا، کچھ لیٹے بیٹھے، اتنے میں ظہر کا وقت آ گیا، نماز پڑھی، شام کو بعد اِفطار بہت پُر تکلف کھانا آیا، کئی طرح کا، چار پانچ قسم کا تھا، جیسے کہ اُمرا کی عادت ہے، یا متوسط لوگوں میں بھی اپنے خاص خاص معزز مہمانوں کے لیے کئی کئی کھانے پکوانے کی عادت ہے۔ بہت ہی عنایت تھی، ورنہ مولاناؒ کی وضع بالکل آزادانہ تھی، وہاں تکلفات کی بھلا کیا گنجایش؟ اسی طرح سحری میں بھی کئی قسم کا کھانا آیا، غرض ایک آدھ دن جب گزرا میں نے واپسی کی اجازت چاہی، اور اس درمیان میں مختلف جلسوں میں مختلف باتیں فرماتے رہے، جو کہ اب یاد بھی نہیں۔

حصن حصین حضرتؒ سے پڑھی:

بہرحال جب میں نے اجازت چاہی، فرمایا: ''اجی کیا جلدی ہے؟ مدرسے کی تعطیل ہے، رمضان شریف کا زمانہ ہے، اور ٹھہرو۔''

ہم تو یہ چاہتے ہی تھے، حضرتؒ کے اِرشاد کو غنیمت سمجھا اور واپسی کے ارادے کو ملتوی کر دیا۔ جب میں نے دیکھا کہ رہنا تو ہو ہی گیا ہے، لاؤ حضرتؒ سے ''حصن حصین'' ہی پڑھ لیں؟ چناں چہ میں نے عرض کیا، حضرتؒ نے بڑی خوشی سے فرمایا: ''بہت اچھا''۔ میں نے شروع کیا، حضرتؒ کہیں کہیں کچھ تحقیق

بھی فرماتے جاتے تھے۔ چناں چہ ایک جگہ "شَوْقًا اِلٰی لِقَآئِكَ" آیا تو فرمایا: ''اچھا بتاؤ! شوق کا کیا ترجمہ ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''حضرت ہی ارشاد فرمائیں''۔ فرمایا: ''تڑپ!''

اور درمیان میں مختلف وقتوں میں نعرے بھی لگاتے تھے ذوق وشوق میں۔

کھانا برابر تکلف کا آتا رہا۔ لطیف اور کئی کئی قسم کا۔ جب ''حصن حصین'' ختم ہوگئی اور ہم لوگ رُخصت ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ 'حضرت! تبرکاً حدیث شریف کی بھی اجازت دے دیجیے۔ فرمایا: ''جی ہاں اجازت ہے''۔ یہ بھی فرمایا کہ ''اجی آیا کرو اور کبھی کبھی کچھ سنا جایا کرو''، لیکن پھر اتفاق حاضری کا نہیں ہوا۔

(نیل المراد فی السفر الٰی گنج مراد آباد، مشمولہ ''ارواحِ ثلاثہ'': ص ۲۴۸-۲۵۶)

ترجمة المصنّف

یعنی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مختصر تاریخی حالات

یادگار قلم: شیخ الحدیث حضرت مولانا الحاج محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے قلم سے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کے یہ حالات ''خوانِ خلیل'' کے ضمائم کے متصل ہی سہارن پور سے شایع ہوئے تھے، لیکن چوں کہ زیرِ نظر مجموعے میں حضرت حکیم الامتؒ کے رسائل ہی ہیں، اس لیے ان حالات کو مجموعے کے آخر میں رکھا گیا ہے، ضمایم کے ساتھ نہیں رکھا گیا۔ (اعجاز)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

اس ناکارہ کے اکابر شموس وبدورِ ہدایت ہر ایک اپنے علوم ومعرفت اور علوِ شان، فقہ وسلوک، تفسیر وحدیث میں ممتاز:

أُولٰئك آبائي فجئني بمثلهم
إذا جمعتنا يا جرير المجامع

الٰہی! کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
کہ ہر اِک دست بوسی کیا قدم بوسی کے قابل ہے
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
ان ہی کے اِتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
اِنھیں کی شان کو زیبا نبوّت کی وراثت ہے
انھیں کا کام ہے دِینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دُنیا میں اور دُنیا سے بالکل بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لیکن اس کے باوجود گل دستے کے پھولوں کی طرح سے ہر ایک کی بُو الگ، نظافت ولطافت الگ اور گل دستہ جب ہی کامل ومکمل ہوسکتا ہے جب کہ اس میں مختلف رنگوں کے اور مختلف خوش بوؤں اور اَداؤں کے پھول ہوں: ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اِختلاف سے

میرے جملہ اکابر کی سوانح عمریاں مختصر ومفصل بہت سی لکھی گئی ہیں، جن میں ان کے علمی کمالات، عملی ریاضات، معارف وعلوم وحکمت پر مختصر، مفصل سب ہی کچھ لکھا گیا، لیکن ان سب کا اِحاطہ نہ ہوسکتا ہے اور نہ مجھ جیسے ناقص العلم والفہم کے اِدراک میں آسکتے ہیں، مگر میرا جی یہ چاہا کرتا ہے کہ ان اکابر کے تاریخی حالات نہایت اِجمالی طور پر ضرور دوستوں کو مستحضر رہیں۔ اس سے دَور اور زمانے کا علم تو ہوتا رہے۔ اسی لیے میں نے اپنے اکابر کا حال جس تذکرے میں

عربی میں یا اُردو میں لکھا بہت مختصر لکھا، چوں کہ ''خوانِ خلیل'' حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تالیف ہے، اور حضرت حکیم الامتؒ کی سوانح عمریاں مختصر ومطوّل ہندوپاک میں بہت سی لکھی جا چکی ہیں، اور گو کمالاتِ علمیہ اور عملیہ تو ان میں بھی نہ آئے۔ ان میں ''اشرف السوانح'' مؤلفہ محبی ومخلصی جناب الحاج خواجہ عزیز الحسن بہت ہی مکمل اور قابلِ اِعتماد ہے کہ خود حضرت حکیم الامتؒ کے زمانۂ حیات میں لکھی گئی اور خود حضرتؒ کی نظرِ ثانی دو حصوں پر ہوئی۔ اس کے بعد جتنی لکھی گئیں وہ سب اسی سے ماخوذ اور ان کا چربہ ہیں، جو مختلف اہلِ ذوق نے اپنے ذوق کے موافق لکھی ہیں۔ میرا ذوق جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا نہایت مختصر تاریخی حالات لکھ دینے کا ہے۔ اسی لحاظ سے اس مختصر مضمون میں ''خوانِ خلیل'' کے مصنف حضرتِ اقدس حکیم الامت نوّر اللّٰہ مرقدہٗ کے مختصر تاریخی حالات لکھنے کا ہے۔

ایک میرا اور ایک دنیادار:

یہ تو مشہور ہے کہ آپ کی پیدائش ایک صاحبِ خدمت مجذوب حافظ غلام مرتضٰی پانی پتیؒ کی دُعا سے ہوئی، اس لیے کہ آپ کے والد صاحبؒ نے مرضِ خارش سے تنگ آ کر اطبا کے مشورے سے کوئی دوا قاطع النسل کھالی تھی، جس کی وجہ سے اولاد کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ آپ کی نانی صاحبہ بہت پریشان تھیں، انہوں نے اپنی لڑکی (یعنی آپ کی والدہ ماجدہ) کے لیے دُعا کرائی، ان مجذوب نے پیشین گوئی کی کہ

> ''اس لڑکی سے دو لڑکے پیدا ہوں گے: ایک میرا ہوگا، جو مولوی، عالم، حافظ ہوگا۔ اس کا نام اشرف علی رکھنا، اور دُوسرا دُنیادار ہوگا، اس کا نام اکبر علی رکھنا۔''

حضرت حکیم الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ

''میں جو کسی وقت اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں تو انہی مجذوب صاحب کی رُوحانی توجہ کا اثر ہے، جن کی دُعا سے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیوں کہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔''

تاریخِ ولادت اور تعلیم:

۵ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ (۱۹ ستمبر ۱۸۶۳ء) کو بدھ کے دن صبح صادق کے وقت آپ کی ولادت ہوئی۔ تاریخی نام ''کرم عظیم'' ہے۔ دادھیالی نام ''عبدالغنی'' تجویز ہوا، اور نانیہالی ''اشرف علی''۔ پھر اسی کو غلبہ ہوا۔

حضرتؒ کا تعلیمی دور قرآن شریف سے شروع ہوا، چند پارے آپ نے کھتولی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اخون جی سے پڑھے، پھر حافظ حسین علی صاحبؒ جو دہلی کے رہنے والے تھے اور میرٹھ میں قیام تھا۔ آپ نے دس سال کی عمر میں حفظ سے فراغت پائی تھی۔ فارسی کی تعلیم میرٹھ کے اُستاذوں سے حاصل کی اور پھر متوسطات تھانہ بھون میں حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ سے پڑھیں، اور اِنتہائی کتب فارسی ''ابوالفضل'' تک اپنے ماموں واجد علی صاحبؒ سے پڑھیں، جو اَدب فارسی کے اُستاذِ کامل تھے۔ اس کے بعد دیوبند تشریف لے گئے، عربی کی اِبتدائی چند کتابیں مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ سے پڑھیں، اور فارسی کی چند کتابیں ''سکندر نامہ'' وغیرہ بھی دیوبند میں مولوی منفعت علی صاحبؒ سے پڑھیں۔ دیوبند کا داخلہ آخر ذِی قعدہ ۱۲۹۵ھ (نومبر ۱۸۷۸ء) میں ہے۔ وہاں جا کر حضرتؒ نے ''نور الانوار، مُلّا حسن، مشکوٰۃ شریف، مختصر المعانی'' شروع کیں اور پانچ سال تک مسلسل دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی، لیکن دورانِ تعلیم میں حضرتؒ کو خارش کا مرض لاحق ہوا، جب کہ حضرتؒ کی عمر اٹھارہ

برس کی تھی، چھٹی لے کر اپنے مکان تھانہ بھون تشریف لے گئے اور چوں کہ طلبِ علم کا زمانہ شروع ہو چکا تھا، خالی رہنا مشکل تھا، اس لیے بہ طور مشغلے کے مثنوی زیر و بم تصنیف فرمائی، جس کا پہلا شعر جو اس کی تمہید ہے، یہ ہے:

ہمی گوید گرفتار درد و نالہ
نادان ہشت دہ سالہ

۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) جب کہ حضرتؒ کی عمر بیس سال کی تھی، علومِ ظاہریہ سے فراغت حاصل کی۔ حضرت حکیم الامتؒ کی طالب علمی کے زمانے میں ان کی تائی صاحبہ نے فرمایا کہ

"بھائی! تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے، وہ تو خیر کما کھائے گا، اور بڑا عربی پڑھ رہا ہے، اس کی گزر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیوں کہ جائیداد وارثوں میں تقسیم ہو کر قابل گزارہ کے نہ رہے گی۔"

یہ بات والد صاحبؒ کو بہت ناگوار ہوئی، اور باوجود اس کے کہ تائی صاحبہ کا بہت ادب کرتے تھے، یہ سن کر جوش آگیا اور کہنے لگے کہ

"بھابھی صاحبہ! یہ تم نے کیا کہا؟ خدا کی قسم! جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے، اور یہ ان کی جانب رُخ بھی نہ کرے گا۔"

یہ مقولہ نقل کر کے حضرت حکیم الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ

"اگر یہ بات کوئی درویش کہتا تو اس کی بڑی کرامت سمجھی جاتی، لیکن والد صاحبؒ تو دُنیا دار سمجھے جاتے تھے"۔

دیوبندی دور کے اساتذۂ کرام:

۱- حضرتِ اقدس نانوتوی قدس سرہٗ- حضرت حکیم الامتؒ نے ان سے کوئی

سبق تو نہیں پڑھا، لیکن درسِ جلالین میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۲- حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، مدرّسِ اوّل، جو حضرت حاجی صاحبؒ کے اکابر خلفا میں شمار ہوتے تھے، اور اَسباق میں بھی علومِ ظاہریہ کے ساتھ علومِ باطنیہ سے بھی طلبا کو مستفید فرماتے تھے۔

۳- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ مدرّسِ چہارم، جب کہ حضرت حکیم الامتؒ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں دیوبند میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ الہندؒ کے پاس ''مختصر المعانی'' اور ''مُلّا حسن'' کے اسباق پڑھے۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی تعلیم کی تفصیل ''سبع سیارہ'' میں لکھی ہے۔

ان دو کے علاوہ حضرتؒ کے اساتذہ میں مولانا سیّد احمد صاحبؒ مدرّسِ دوم اور مُلّا محمود صاحبؒ مدرّسِ سوم اور مولانا عبد العلی صاحبؒ بھی تھے۔

''ذِکرِ محمود'' میں ہے کہ ابتدائے حاضری سے فراغ تک حضرت شیخ الہندؒ کے پاس میرے اسباق رہے، جن میں حمد اللہ، میر زاہد، رسالہ میر زاہد، مُلّا جلال اور فقہ میں ہدایہ آخرین، اور حدیث کی متعدّد کتب پڑھیں، جن کی تفصیل ''سبع سیارہ'' رسالے میں ہے، اور قراءت کی مشق مکہ مکرمہ کی حاضری پر شیخ القراء قاری عبد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے کی۔ ''اشرف السوانح'' میں تحریر ہے کہ جب مدرسۂ صولتیہ کے بالائی حصے پر قاری صاحبؒ حضرت تھانویؒ کو مشق کراتے تو نیچے سے سننے والے کو بسا اوقات اُستاذ وشاگرد کی آواز میں اِشتباہ ہوتا تھا۔

تدریس اور تنخواہ:

دار العلوم سے فراغ پر آخر صفر ۱۳۰۱ھ (دسمبر ۱۸۸۳ء) میں مدرسہ فیضِ عام کان پور کی صدر مدرّسی پر بہ مشاہرہ پچّیس روپے تشریف لے گئے۔ حضرت حکیم الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ

"تعلیم کے زمانے میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ دس رپے تنخواہ کافی سمجھا کرتا تھا۔ پانچ رپے اپنی ضرورت کے لیے، اور پانچ رپے گھر والوں کی ضرورت کے لیے۔"

فیضِ عام میں تشریف لے جانے کے تین چار ماہ بعد مواعظ کی شہرت ہوئی، تو اہلِ مدرسہ نے اس پر زور دِیا کہ حضرتؒ اپنے مواعظ میں مدرسے کے لیے چندہ بھی کیا کریں، جس کو حضرتؒ نے قبول نہیں کیا۔ اس پر اِختلاف ہوا اور حضرت استعفیٰ دے کر چلے آئے، مگر چوں کہ اہلِ کان پور گرویدہ ہو چکے تھے، اس لیے جب حضرتؒ واپسی کے لیے اس نیت سے کہ پھر ادھر آنا ہو یا نہ ہو، گنج مرادآباد حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کی زیارت کے لیے پہنچے اور زیارت وغیرہ کے بعد دوبارہ کان پور سامان لینے کے لیے پہنچے تو حاجی عبد الرحمٰن صاحبؒ نے اپنے محلے کی جامع مسجد محلّہ پٹکا پور میں ایک مدرسہ جامع العلوم کے نام سے تجویز کیا، اور اس میں بہ اصرار حضرتؒ سے قیام کی درخواست کی۔ چناں چہ پچّیس رپے پر حضرتؒ نے وہاں قیام منظور فرمالیا۔

علم طب:

جامع العلوم کے قیام کے دوران میں حضرتؒ کو خیال ہوا کہ تنخواہ لے کر دِین کی خدمت گو جائز ہے، لیکن جی اس کو پسند نہ کرتا تھا، اس لیے کچھ دنوں بعد دہلی جاکر حکیم عبد المجید صاحبؒ سے طب کی تعلیم شروع کی، تاکہ گزر اوقات مطب سے ہو اور خدمتِ دِین لوجہ اللہ تعالیٰ، لیکن حضرتؒ کے دہلی جانے پر اہلِ کان پور مضطربانہ دہلی پہنچے اور واپسی پر اِصرار کیا۔

دہلی کے دورانِ قیام میں حضرتؒ کے ہم سبق جناب الحاج جمیل الدین صاحب نگینوی نوّر اللہ مرقدہٗ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ طب کا مشغلہ ہرگز اِختیار نہ

کیا جائے، کہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مطب کے ساتھ دِین اور علمِ دِین کی خدمت نہیں ہوتی (۱)۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اَزخود اُستاذ سے سبق چھوڑ کر واپس آنا خلافِ ادب سمجھا، اس لیے اہلِ کان پور سے کہا کہ تم اُستاذ سے خود اِجازت لو، ان کے اِصرار پر حکیم عبدالمجید صاحبؒ نے حکیم الامتؒ سے فرمایا کہ

''اگر تم ترقی کرنا نہیں چاہتے تو اِجازت ہے''۔

حضرت تھانویؒ نے پندرہ روز دہلی قیام کے بعد کان پور مراجعت فرمائی۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کو جب مشغلۂ طب چھوڑ کر کان پور مراجعت کی اطلاع ہوئی تو حضرتؒ نے بہت اِظہارِ مسرّت فرمایا اور فرمایا کہ

''طبابت کے شغل کو ترک کر کے کان پور آ کر دِینیات کے شغل کا حال معلوم ہو کر بے حد مسرّت ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات میں برکت فرمائے، آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں کو بہت مستفیض فرمائے۔ میں نے آپ کو پہلے ہی مشورہ دِیا تھا کہ دِین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیے، دُنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کے لیے حاضر رہا کرے گی۔ بہرکیف! آپ لوگ علماء ورثۃ الانبیاء ہیں، آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کیے ہیں، پس اپنے مقصود کا خوب خیال رکھنا چاہیے۔'' (مکتوباتِ اِمدادیہ: ص ۳)

حضرت گنگوہیؒ کا بیعت کی درخواست رد کرنا:

طالب علمی کے آخری دور میں دیوبند کے قیام میں ایک مرتبہ حضرت گنگوہی

---

(۱) حضرت اقدس قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ کا مشہور مقولہ ہے کہ جسے دنیا سے کھونا ہو کسی خانقاہ میں بٹھادو، اور علمِ دِین سے کھونا ہو تو علمِ طب پڑھادے، اور دونوں سے کھونا ہو تو شاعری سکھادے۔ (زکریا)

قدس سرہٗ کی دیوبند تشریف بری پر بیعت کی درخواست کی تھی، لیکن حضرت قطبِ عالمؒ نے یہ کہہ کر کہ

''طالب علمی کے زمانے میں شغلِ باطن مخل تحصیلِ علم ہوگا۔''

اِنکار فرمادیا تھا، جس کو حضرت تھانویؒ نے دفع الوقتی پر حمل فرمایا، جس کی تفصیل ''یادِ یاراں'' میں مذکور ہے، لیکن اسی زمانے میں ایک دُوسرے طالبِ علم کو حضرتؒ نے بیعت فرمالیا، جس سے حضرت تھانویؒ کو بہت قلق ہوا۔

اعلیٰ حضرتؒ سے بیعت:

۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کے ہاتھ ہی دستی خط حضرت شیخ المشائخ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں لکھا کہ

''میں نے مولانا سے درخواست بیعت کی تھی، مولانا نے اِنکار کردیا، جناب سفارش فرمادیں۔''

اور اعلیٰ حضرتؒ کی حضرت قطبِ عالمؒ سے جو گفتگو ہوئی وہ تو معلوم نہیں، لیکن حضرت تھانویؒ کے خط کا جو جواب حضرت شیخ المشائخؒ نے مرحمت فرمایا تھا، اس میں بجائے سفارش کرنے کے خود ہی خط سے بیعت فرمالیا۔

سفرِ حج اور اس کے اسباب:

اور اس سے بہت قبل حضرت حاجی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ نے حضرت حکیم الامتؒ کے والد کو ایک خط لکھا تھا کہ

''جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر آنا۔''

حال آں کہ حضرت شیخ العرب والعجمؒ کو اس وقت حضرت تھانویؒ سے کوئی خصوصی تعارف بھی نہ تھا۔ خط سے بیعت کے بعد من جانب اللہ حاضری کی صورت بھی پیدا ہوئی، وہ یہ کہ اس زمانے میں دیوبند میں کوئی کمپنی قایم ہوئی تھی،

جس میں فی حصہ پانچ سو روپے کا تھا، اور ایک شخص کو ایک حصے سے زاید لینے کا حق نہ تھا، مگر حضرت تھانویؒ کے والد صاحبؒ نے اپنے تمول کی وجہ سے تین حصے اس طرح لیے: ایک اپنے نام سے، دُوسرا حضرت تھانویؒ کے نام سے، اور تیسرا حضرتؒ کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی کے نام سے، اور کچھ عرصے بعد بعض وجوہ سے اس رقم کو واپس لے لیا۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے اپنے والد صاحبؒ کو لکھا کہ جو حصہ آپ نے میرے نام سے جمع کیا تھا اور اَب واپس لے لیا وہ میری مِلک ہے یا آپ کی؟ اس پر والد صاحبؒ نے جواب دیا کہ اب تک تو میری مِلک تھی، اور مصلحتاً تمہارا نام لکھا تھا، لیکن (اب) تمہاری مِلک ہے۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے لکھا:

''اب تو اس رقم کی زکوٰۃ بھی مجھ پر واجب ہے اور اس کی وجہ سے
مجھ پر حج بھی فرض ہوگیا۔''

والد صاحبؒ نے زکوٰۃ کی رقم تو نقد بھیج دی، اور حج کے متعلق لکھا کہ میں تمہاری چھوٹی بہن یعنی والدہ ماجدہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی (شیخ الاسلام پاکستان) کے نکاح سے فارغ ہوجاؤں تو آیندہ سال حج کے لیے جاؤں گا، اس وقت تم بھی ساتھ چلنا۔ حضرت تھانویؒ نے لکھا، اگرچہ والد کا ادب بھی بہت کرتے تھے اور ڈرتے بھی بہت تھے:

''آپ مجھے یہ لکھ دیجیے کہ تو آیندہ سال تک زندہ رہے گا!''

اس پر والد صاحبؒ نے لکھا کہ

''یہ میں کیسے لکھ سکتا ہوں؟''

تو حضرت تھانویؒ نے لکھا کہ

''پھر حج کو کیسے مؤخر کرسکتا ہوں؟''

اس پر والد صاحبؒ نے بہت ہی عجلت کی حالت میں شوال ۱۳۰۱ھ (اگست

۱۸۸۴ء) میں نہایت عجلت میں اپنی صاحب زادی کا کھڑے کھڑے نکاح پڑھ دیا، اور شادی کی تقریبات سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت تھانویؒ کے ساتھ حج کو روانہ ہوگئے۔ جب کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو کان پور کی ملازمت کو چند ماہ ہی ہوئے تھے۔

اس سال دریا میں طغیانی بہت شدّت سے تھی، راستے میں والد صاحبؒ کے دوستوں نے طغیانی سے ڈرایا بھی، مگر والد صاحبؒ نے فرمایا کہ "اب تو اِرادہ کرلیا ہے۔" واقعی سمندر میں بہت زیادہ طغیانی تھی اور حضرتؒ کا جہاز حیدری نام بہت چھوٹا جہاز تھا، جو طغیانی کا تحمل نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی اِدھر جھکتا کبھی اُدھر۔ موج کا پانی جہاز کے اُوپر کو گزرتا اور سب سامان کو بھگو دیتا، لیکن اللہ کے فضل سے نہایت عافیت کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ

"جب اوّل بار بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو اس طرح کیفیت اِنجذابیہ شوقیہ ہوئی کہ پھر عمر بھر بھی کبھی نہیں ہوئی۔"

اعلیٰ حضرت مہاجر مکیؒ کو بھی حضرتؒ کی حاضری پر نہایت مسرّت ہوئی، اور اِرشاد فرمایا کہ "تم چھ ماہ میرے پاس رہ جاؤ۔"

لیکن والدؒ نے مفارقت گوارا نہ کی تو اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا کہ "اب تو والد کی اطاعت کرو، پھر کبھی موقع ہوا تو چھ ماہ آ کر رہ جانا۔"

اس سفر میں تجدید بیعت دست بہ دست بھی ہوگئی، اور حضرت حکیم الامتؒ کے والد بھی اسی سفر میں مشرف بہ بیعت ہوئے۔ باوجود اعلیٰ حضرتؒ کی خواہش کے والد صاحبؒ نے مفارقت گوارا نہ کی، اس لیے واپس آنا پڑا، لیکن باوجودے کہ حجاز سے واپسی پر جامع العلوم کان پور میں درس و تدریس کا سلسلہ چلتا رہا، لیکن دن بہ دن طبیعت پر علومِ باطنی کی طرف میلان بڑھتا رہا، اور ۱۳۰۷ھ

(۱۸۹۰ء) میں ذِکر و شغل کی طرف جب زیادہ میلان بڑھ گیا تو حضرت حاجی صاحبؒ سے ترکِ ملازمت کی اجازت چاہی، لیکن حاجی صاحبؒ نے منظور نہیں فرمایا، جو مفصل تو ''مکتوباتِ اِمدادیہ'' میں ہے، اور مختصر ''اشرف السوانح'' میں ص ۱۷۳ پر فارسی میں بھی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''ذوق وشوق کے حالات سے ترقی کا اندازہ ہوا، البتہ ملازمت کا ترک تعلق مناسب نہیں کہ یہ تجردانہ زندگی کے مناسب ہے۔ اہل وعیال کو مضطرب چھوڑنا ناعاقبت اندیشی ہے۔''

یہ والانامہ ۲۲/محرم ۱۳۰۸ھ (۷/ستمبر ۱۸۹۰) کا ہے۔

دوبارہ سفرِحجاز اور اعلیٰ حضرتؒ کی طرف سے خلافت:

اسی ذوق وشوق میں حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کے عرائض بار بار لکھے اور چوں کہ ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں والد صاحب کا اِنتقال ہو چکا تھا، اس لیے اجازت کا مسئلہ بھی نہ تھا، ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) کے آخر میں حج کے لیے روانہ ہوئے، اور اعلیٰ حضرتؒ کی تمنا کہ ''چھ ماہ میرے پاس رہو'' کو پورا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں جانے کے بعد اعلیٰ حضرتؒ کے ایسے منظورِ نظر بنے کہ لوگوں کو رَشک ہی نہیں حسد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت تھانویؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ

''میں یہ چاہا کرتا تھا کہ حضرت میرے اُوپر سب کے سامنے اتنی شفقت نہ فرمایا کریں تو اچھا ہے۔''

آخر میں حضرت تھانویؒ کو حاسدین سے اتنا اندیشہ ہو گیا تھا کہ پورے چھ ماہ کا اِرادہ پورا نہ ہو سکا، اور ہفتہ عشرہ پہلے ہی تشریف لے آئے کہ ابھی تو میں حضرتؒ کے یہاں مقبول ہوں، آیندہ کہیں لگائی بجھائی کرنے والے حاسدین

حضرتؒ کو میری طرف سے مکدّر نہ کردیں، اس لیے اِنشراح کی حالت میں ہی رُخصت ہو جانا چاہیے، اور اسی سفر میں اعلیٰ حضرتؒ کی طرف سے اجازتِ بیعت بھی حاصل ہوگئی۔

ماموں کی خدمت:

واپسی پر اپنے مشغلۂ علمیہ میں مشغول رہے۔ اسی دوران میں حضرتؒ کے ماموں پیر جی اِمداد علی جو عرصے سے حیدرآباد (دکن) میں مقیم تھے اور نہایت مغلوب الحال والمقال۔ حیدرآباد سے واپسی میں کان پور کو قصداً اس تمنا میں گزرے کہ بھانجے کو بھی جن کا شہرہ سن رہے تھے، ملاقات کروں۔ وہ کان پور میں آکر سرائے میں ٹھہرے اور حضرتؒ کو اِطلاع دی کہ ''اگر تم اپنی وضع کے خلاف نہ سمجھو تو مجھ سے سرائے میں آکر مل جاؤ''۔

حضرتؒ ملنے تشریف لے گئے اور بہ اصرار اپنے مکان پر لے آئے۔ ماموں صاحب نے فرمایا بھی کہ ''میاں! تم عالم باعمل ہو، مجھے اپنے یہاں نہ لے جاؤ کہ دیکھنے والے یہ کہیں گے کہ کس لُچّے کو لے آئے؟''

مگر حضرتؒ کے اِصرار پر پیر جی صاحب مع اپنے ساز وسامان کے جس میں آلاتِ سماع بھی تھے، مکان پر آگئے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''ماموں صاحب میں اتنی سوزش تھی کہ کلمات سے آگ سی نکلا کرتی تھی۔''

جس پر حضرت تھانویؒ کو ایک جوش پیدا ہوا کہ جس طرح بھی ہو ان سے عشق کی آگ لی جائے اور بے اِختیار ماموں صاحب کی طرف رُجوع کرلیا۔ حضرت تھانویؒ کا یہ رُجوع دُوسری مرتبہ تھا، پہلی مرتبہ سفرِ حج ثانی ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) سفرِ اجازتِ بیعت سے پہلے کا ہے، اس کا بیان ''اشرف السوانح'' صفحہ 215 پر ہے۔ بعض حضرت تھانویؒ کے سوانح لکھنے والوں نے دونوں کو خلط کر دیا۔ اسی

دُوسرے رُجوع پر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی وہ خط وکتابت ہے جو ''تذکرۃ الرشید'' میں مفصل موجود ہے۔ حضرت تھانویؒ کے اس رُجوع پر حضرت گنگوہیؒ نے مولانا منوّرعلی صاحبؒ کے واسطے سے حضرت تھانویؒ سے شکوہ کیا، جس کا مختصر ذِکر ''یادِ یاراں'' میں بھی ہے۔ ''اشرف السوانح'' میں تو یہ قصہ بہت مختصر اور خط کی طرف صرف اشارہ ہے، لیکن ''تذکرۃ الرشید'' جلداوّل، صفحہ ۱۱۴ پر یہ تذکرہ حضرت گنگوہیؒ وحضرت تھانویؒ کی مکرّر سہ کرّر مراسلت کے ذیل میں مذکور ہے۔ البتہ ''اشرف السوانح'' کی ترتیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ وہنگامہ حضرت تھانویؒ کے دُوسرے سفرِ حج اور اِجازت سے قبل کا ہے، لیکن ''تذکرۃ الرشید'' میں ان خطوط پر جو تاریخیں درج ہیں ان میں حضرت تھانویؒ کے سب سے پہلے خط پر ۲۹/ذی قعدہ ۱۳۱۴ھ (یکم مئی ۱۸۹۷ء) ہے، اور حضرت گنگوہیؒ کے جواب پر ۵/ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ (۷/مئی ۱۸۹۷ء) ہے۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ کا دُوسرا عریضہ ۱۳/ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ (۱۵/مئی ۱۸۹۷ء) کا ہے، اور حضرت گنگوہیؒ کا جواب ۵/محرم الحرام ۱۳۱۵ھ (۶/جون ۱۸۹۷ء) کا ہے، اور تیسرا عریضہ حضرت تھانویؒ کا ۸/محرم ۱۳۱۵ھ (۹/جون ۱۸۹۷ء) کا ہے، اور اس پر حضرت گنگوہیؒ کا جواب ۱۲/محرم ۱۳۱۵ھ (۱۳/جون ۱۸۹۷ء) کا ہے۔ اس کے بعد بھی کئی مکاتبتیں ہیں، آخری مکاتبت میں حضرت تھانویؒ کا رُجوع اور حضرت گنگوہیؒ کا اس پر تشکر ہے، جو بہت طویل خط وکتابت ہے، جو ''تذکرۃ الرشید'' میں دیکھی جاسکتی ہے(۱)، لیکن اس ناکارہ زکریا کے خیال میں ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں مکۂ مکرمہ سے واپسی پر اعلیٰ حضرتؒ نے جو دو وصیتیں فرمائی تھیں:

(۱) یہ تمام خط وکتابت زیرِنظر مجموعے میں ''یادِ یاراں'' کے ضمیمے کے طور پر شامل کردی گئی ہے۔ (اعجاز)

''میاں اشرف علی! ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی، عجلت نہ کرنا، اور کبھی کان پور کے تعلق سے دِل برداشتہ ہو تو پھر دُوسری جگہ تعلق نہ کرنا، توکل بہ خدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔''

(اشرف السوانح: ج۱ص۲۰۷)

اس سفرِ حج سے واپسی کے بعد سے حضرتؒ کا تبتل کا میلان تو بڑھتا ہی گیا، حضرت تھانویؒ کا خود اِرشاد ہے کہ

''حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت سے واپسی کے بعد ایک سال کے قریب میں نے وعظ نہیں کہا۔ لوگ بہت اِصرار کرتے تھے مگر مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی کہ ایسے خراب شخص سے کیوں وعظ کے لیے کہتے ہیں؟ ایک مرتبہ بہت اِصرار کیا تو میں رونے لگا، اس کے بعد اِصرار نہیں ہوا۔'' (حسن العزیز: ج۱ص۱۶۶)

اس دوران میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے ترکِ ملازمت کی دو مرتبہ اجازت بھی چاہی، جو مجھے ''تذکرۃ الرشید'' میں یاد ہے، مگر حضرت گنگوہیؒ نے دونوں مرتبہ اجازت نہیں فرمائی، اور تیسری مرتبہ حضرت تھانویؒ نے ترکِ ملازمت کے بعد یہ لکھا کہ

''حضرت! مجھ سے تحمل نہیں ہوا، میں چھوڑ کر چلا آیا۔''

تو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دُعائیں دِیں۔

میرے والد صاحب حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کاتبِ خطوط نے پہلے دو خطوں پر بھی بہت سفارش کی کہ اللہ کا نام ایک شخص توکلاً علی اللہ بلامعاوضہ سکھانے کا اِرادہ کرتا ہے تو حضرت کیوں منع فرماتے ہیں؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ''جو میں کہتا ہوں لکھ دو!'' اور تیسرے جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دُعائیں دیں تو میرے والد صاحب نے پھر عرض کیا کہ: پہلے دو خطوں میں تو

حضرت نے یہ لکھوایا تھا اور اَب اِظہارِ مسرّت کیا۔ تو حضرتؒ نے فرمایا کہ

"آدمی مشورہ جب کیا کرتا ہے جب تردّد ہو، اور جب تک تردّد ہو توکل ٹھیک نہیں۔"

یہ قصہ میں نے بڑی تفصیل سے اپنے والد صاحبؒ سے بھی سنا تھا اور "تذکرۃ الرشید" میں بھی یاد ہے، مگر اس وقت مراجعت دُشوار ہے۔

بہرحال حضرت حکیم الامتؒ اَوائل ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں کان پور سے ترکِ ملازمت کر کے تھانہ بھون تشریف لائے، جس کی تفصیل "اشرف السوانح" صفحہ ۲۲۹ پر ہے۔ تھانہ بھون تشریف آوری کے بعد حضرت حکیم الامت نوّر اللہ مرقدہٗ پر کچھ قرضہ ہوا، جس کی دُعا کے لیے اعلیٰ حضرتؒ کو مکہ مکرمہ اور قطب الارشاد کو گنگوہ لکھا۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ کا جواب تو یہ آیا کہ

"آپ کی اِستقامت اور توکل میں کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔"

(مختصر مکتوب نمبر ۳۷، ۶ر رجب ۱۳۱۵ھ (یکم دسمبر ۱۸۹۷ء))

اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ

"اگر کہو تو مدرسۂ دیوبند میں تمہارے لیے مدرّسی کی تحریک کروں؟"

اس پر حضرت تھانویؒ نے عرض کیا کہ

"میرا تو عرض کرنے کا مقصد صرف دُعا ہے، باقی حضرت حاجی صاحب نے بعد ترکِ تعلق کان پور کسی اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی ممانعت فرمادی ہے، لیکن اگر حضرت کی یہی تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا، اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اَب یہ صورت تجویز فرمادی ہے۔"

یہ سن کر حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فوراً گھبرائے ہوئے سے لہجے میں فرمایا

کہ

''نہیں، نہیں! اگر حضرت حاجی صاحب کی ممانعت ہے تو میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا، میں دُعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ قرض سے سبک دوش فرمائے۔''

چناں چہ دونوں حضراتؒ کی دُعا کی برکت سے قرضے سے جلدی سبک دوشی ہوگئی اور پھر بفضلہٖ تعالیٰ کبھی تنگی نہیں ہوئی۔ (اشرف السوانح: ص ۲۳۵)

حضرت تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ کے دو نکاح ہوئے، پہلا طالب علمی کے دوران میں، جس کو حضرت تھانویؒ نے ''یادِ یاراں'' میں اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ:

''جب احقر کا گنگوہ میں نکاح ہوا، غالباً ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) تھا، والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ، کہ والد مرحوم ان کی ریاست میں مختار تھے، والد صاحب کی درخواست پر انہوں نے نکاح میں شرکت کی۔ نکاح حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے پڑھا تھا۔ جب حضرت قدس سرہٗ مجلسِ نکاح سے واپس ہوگئے تو شیخ صاحب بھی ساتھ ساتھ چلے گئے۔ شیخ صاحب نے خود مجھ سے ایک دفعہ کہا کہ 'میں نے بہت سے بزرگ دیکھے، بڑے بڑے حکام سے ملا، لیکن جو رُعب وہیبت حضرتؒ کی دیکھی، وہ کسی میں نہیں دیکھی، یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔' ان کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت تھی۔ الخ۔''

دُوسرا نکاح اپنی ہمشیر زادہ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، (برادرِ بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان) کی بیوہ سے ہوا، یہ نکاح وسط رمضان ۱۳۳۴ھ (جولائی ۱۹۱۶ء) میں ابتداءً وکالت کے ذریعے سے ہوا تھا، لیکن ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے حضرت نوّر اللہ مرقدہٗ کو ایک طلاق دینی پڑی، اور

اس پر اہلیہ اُولیٰ نے خود کیرانہ جا کر سب کو اَز سرِ نو راضی کر کے اور حضرت کو بُلا کر تجدیدِ نکاح کی۔ اِس میں بھی بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں، حضرت قدس سرہٗ نے اس سلسلے میں ایک مستقل رسالہ بھی "الخطوب المذیبة للقلوب المنیبة" تحریر فرمایا۔

وصال کے وقت دونوں اہلیہ حیات تھیں۔ بڑی اہلیہ محترمہ کا چند سال بعد تھانہ بھون میں اِنتقال ہو چکا۔ دُوسری اہلیہ محترمہ تقسیمِ ہند کے بعد اپنے داماد مفتی جمیل احمد صاحب مفتی جامعہ اشرفیہ کے ساتھ لاہور تشریف لے گئیں، جو اس رسالے کی تالیف تک بہ قیدِ حیات ہیں(۱)۔

وفات:

حضرت حکیم الامتؒ اصلاح ورُشد وہدایت کے ساتھ خانقاہِ امدادیہ کی زینت بنے رہے، اور سلسلۂ علالت تو کچھ دنوں پہلے سے شروع ہو گیا تھا، اور بڑی اہلیہ کی اجازت سے اہلیہ محترمہ صغریٰ کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ علالت زور پکڑتی رہی، مختلف علاج تجویز ہوتے رہے کہ ۱۵؍رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹؍جولائی ۱۹۴۳ء یومِ دوشنبہ (پیر) کی صبح ہی سے حضرتؒ فرمانے لگے کہ

"آج ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔"

ظہر کے بعد سے سوئے تنفس پیدا ہو گیا، فرمایا کہ

"اتنی تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی۔"

لیکن بجائے کراہنے کے لفظ "اللہ" درد کے ساتھ زبان سے نکلتا تھا، اور دو

---

(۱) حضرتؒ کی دوسری اہلیہ محترمہ ۱۱؍رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ/۱۶؍مارچ ۱۹۹۲ء کو لاہور میں وفات پاگئیں، اور علامہ اقبال ٹاؤن کے قدیم قبرستان میں مدفون ہوئیں۔ (اعجاز)

شنبہ (پیر)، سہ شنبہ (منگل) کی درمیانی شب میں ساڑھے دس بجے وصال ہوا۔ مولانا شبیر علی صاحبؒ برادرزادہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت قدس سرہٗ نے گویا متبنّیٰ (منہ بولا بیٹا) بھی بنا رکھا تھا، پیر کی صبح کو سہارن پور دوائیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے، حضرت قدس سرہٗ نے بارہا ان کو طلب کیا کہ کچھ معاملات فرمانا چاہتے تھے، مگر مولانا شبیر علی صاحب مرحوم وصال کے بعد پہنچے اور ان ہی کی تجویز سے تدفین صبح کے بعد قرار پائی۔

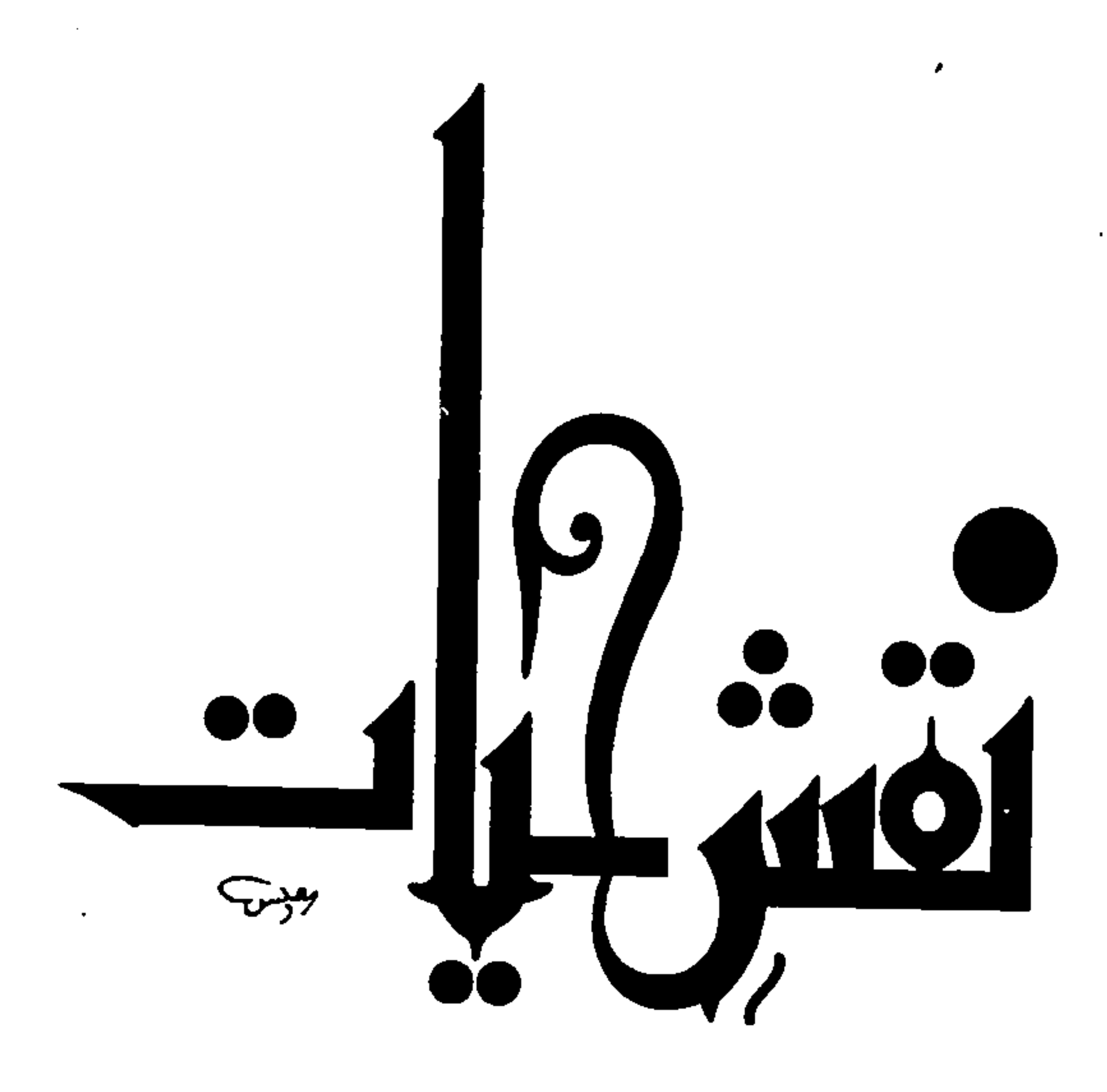
منگل کی صبح نماز سے پہلے سہارن پور آدمی پہنچ گیا، اور بھی قرب وجوار میں بجلی کی طرح سے اطلاعیں پہنچ گئیں۔

یہ ناکارہ تو خبر سنتے ہی فوراً اسٹیشن روانہ ہوگیا اور عین گاڑی کی روانگی کے وقت بلکہ چلتی گاڑی میں سوار ہوگیا، اور دس بجے کے قریب تھانہ بھون حاضر ہوگیا، لیکن گاڑی کوئی اور تھانہ بھون جانے والی نہیں تھی، اس لیے اہلِ شہر کی مساعی سے تھانہ بھون کے لیے دو اسپیشل یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے، پہلا اسپیشل تو بارہ بجے کے بعد جب کہ جنازہ عیدگاہ میں تدفین کے لیے لایا جاچکا تھا، پہنچ گیا تھا، اور کچھ لوگ جو جلال آباد کے اسٹیشن سے اُتر کر پاپیادہ تھانہ بھون بھاگ گئے تھے وہ تو نماز میں بھی شریک ہوگئے، اور جو اسپیشل ہی میں گئے وہ دفن میں تو شریک ہوگئے مگر جنازے میں شریک نہ ہوسکے، لیکن دُوسرا اسپیشل تدفین کے بعد پہنچا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ، لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی،
وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا
فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ﴿۲۷﴾

۲۹/ذی قعدہ ۱۳۹۱ھ، دوشنبہ

(۱۶/جنوری ۱۹۷۲ء)



حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی

خودنوشت

آپ کی زندگی کا ایک ایک نقش ہمارے لیے مشعل راہ ہے